ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

دسمبر ۱۹۹۱ء

اِس شمارے کے ساتھ
ایک خوبصورت اسٹیکر
مُفت
حاصل کیجئے

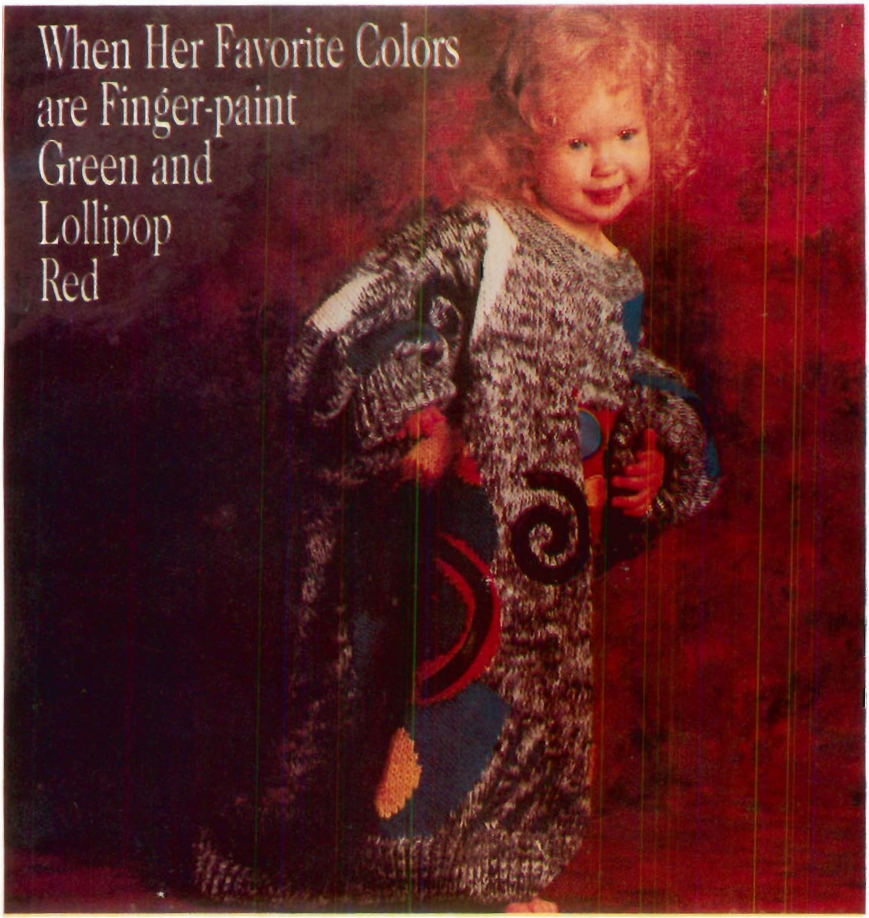

Trust Your Favorite Sweater to Your Drycleaner

Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
Karachi · Multan · Lahore · Rawalpindi

Head office: Snowhite Centre, Abdullah Haroon Road, Karachi Phones: 511711-515904/515083-514018 Fax:

Branches: Bahadurabad, Tel: 413695 ● Burns Road, Tel: 213336 ● Clifton, Tel: 573298 ● Defence, Tel: 577834 ● Gurumandar, Tel: 410521 ● Garden, Tel: 7722433 ● Kharadar, Tel: 204175 ● Shahrah - e - Faisal, 446682 ● M.T Khan Road, Tel: 551370 ● Carpet Cleaning Div., Tel: 515904 ● Multan, Tel: 72780 ● Lahore, Tel: 874933 ● Rawalpindi, Tel: 567988

IMAGE Communications

1941 - 1991
50 Golden Years....
and now looking ahead.

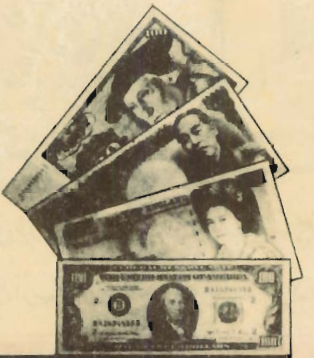

اب

مقیم اور غیر مقیم پاکستانیوں، فرموں اور کمپنیوں کو

فارن کرنسی اکاؤنٹس

کھولنے کی مکمل آزادی ہے

اہم خصوصیات :-

اہلیت : مقیم اور غیر مقیم پاکستانی، فرمیں، کمپنیاں، غیر ملکی افراد اور غیر ملکی کمپنیاں۔

کرنسی : امریکی ڈالر، پونڈ اسٹرلنگ، جرمن مارک اور جاپانی ین۔

ڈیپازٹس : بیرونِ ملک سے موصول ہونے والی رقومات، ٹریولرز چیکس، فارن کرنسی نوٹس اور فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس سے حاصل کردہ زرِ مبادلہ۔

منتقلی/ترسیل : دنیا کے کسی بھی حصے میں رقومات کی آزادانہ اور بلا بندش منتقلی/ترسیل، فارن کرنسی نوٹ اور ٹریولرز چیکس بھی جاری کئے جاسکتے ہیں۔

بندشوں سے مستثنیٰ : فارن ایکسچینج کنٹرول سے آزاد، حصولِ رقم کا ذریعہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس اور زکوٰۃ کی کٹوتی سے مستثنیٰ۔

قرضے : ان کھاتوں کے عوض پاکستانی روپے میں قرضے کی سہولت۔

منافع : بین الاقوامی مالیاتی مراکز کے مقابلے میں زیادہ شرح منافع جو بلحاظِ مدت ۰،۷۵۰۰ فیصدی سے ۱،۶۲۵۰ فیصدی سالانہ تک ہوسکتا ہے۔

فارن کرنسی اکاؤنٹ کھولیئے۔ چند قدم پر ہماری برانچ موجود ہے

حبیب بینک لمیٹڈ

اپنے گولڈن جوبلی سال میں گامزن

پاکستان میں ہماری مجاز شاخیں

سندھ

سینٹرل برانچ، کراچی
بہادر آباد، کراچی
نرسری، کراچی
اسٹیٹ لائف برانچ، کراچی
صدر برانچ، کراچی
سیف ڈپوزٹ والٹ، کراچی
ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای، کراچی
کارپوریٹ برانچ، کراچی
اسٹیشن روڈ۔ حیدر آباد
فریئر روڈ، سکھر

پنجاب

دی مال، لاہور
بادامی باغ، لاہور
سرکلر روڈ، لاہور
ایل۔ ڈی۔ اے برانچ، لاہور
مین مارکیٹ گلبرگ، لاہور
پینوراما سینٹر، لاہور
شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
بالمقابل ہائی کورٹ، لاہور
برانڈرتھ روڈ، لاہور
واپڈا ہاؤس، لاہور
سٹی برانچ، اٹک
پی اے سی کامرہ، ضلع اٹک
فرید گیٹ، بہاول پور
مین برانچ، ڈیرہ غازی خان
مین بازار کلاں، ڈیرہ اسماعیل خان
سرکلر روڈ، فیصل آباد
ڈی گراؤنڈ برانچ، فیصل آباد
بینک اسکوائر، گوجرانوالہ
جی۔ ٹی روڈ، گوجرانوالہ
سرکلر روڈ، گجرات
مین بازار، ہری پور
سی۔ ڈی۔ اے سوک سینٹر، اسلام آباد
اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
کارپوریٹ برانچ، اسلام آباد
شہید روڈ، جھنگ صدر
رام دین بازار، جہلم
ریلوے روڈ، قصور
حسین آگاہی ملتان
کارپوریٹ برانچ، ملتان
کینٹ برانچ، ملتان
بینک روڈ، مردان
بینک اسکوائر، مینگورہ
منڈی روڈ، اوکاڑہ
شاہی روڈ، رحیم یار خان
سٹی برانچ، راولپنڈی
کینٹ برانچ، راولپنڈی
ایس۔ ڈی۔ دی برانچ، راولپنڈی
سٹی برانچ، سیالکوٹ
ایف۔ ایم۔ الہٰی بلڈنگ، سیالکوٹ
ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای برانچ، سیالکوٹ
ٹرنک بازار، سیالکوٹ
جناح چوک، ساہی وال
کچہری بازار، سرگودھا
پی۔ او۔ ایف، واہ کینٹ
مین بازار، وزیر آباد

سرحد

سٹی برانچ، پشاور
کینٹ برانچ، پشاور
تہکال بالا، پشاور
مین بازار، میرپور (آزاد کشمیر)

بلوچستان

کمپلیکس برانچ، کوئٹہ
جناح روڈ، کوئٹہ

PID (Islamabad)
manhattan/BBDO

ناقابلِ یقین | حیرت انگیز | لاجواب | بے مثال

آنکھ مچولی

ویڈیو میگزین

پاکستان میں پہلی بار اپنی طرز کا انوکھا، جدید اور لاجواب چلتا پھرتا ویڈیو میگزین
جسے آپ وی سی آر کے ذریعے اپنے ٹیلیویژن پر دیکھ سکیں گے

جنوری ۱۹۹۲ء کے لئے ماہنامہ آنکھ مچولی کی فخریہ پیشکش

- خوبصورت ڈرامے
- مزے دار خاکے
- لاجواب نغمے
- گیت اور ٹیبلو
- معروف شخصیات
- مشہور کردار
- مزاحیہ خبریں
- سنجیدہ گفتگو
- کام کی باتیں

اور . . . اور وہ سب کچھ جو آپ ایک خوبصورت ویڈیو کیسٹ میں دیکھنا پسند کریں

- ویڈیو کیسٹ کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اپنی تجاویز جلد از جلد بھجوائیے۔
- اپنے محلے کی دُکان پر آنکھ مچولی ویڈیو میگزین کے لیے ابھی سے کہہ دیجئے۔
- آپ کیسٹ کی خریداری میں اپنی دلچسپی سے آگاہ کیجئے۔

مزید تفصیلات کے لیے آنکھ مچولی "عالمی ادب نمبر" دیکھنا نہ بھولیئے

نئی نسل کے ادب کا
بین الاقوامی معیار

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماہنامہ

آنکھ مچولی

مدیر اعلیٰ: ظفر محمود شیخ
مدیر مسئول: تجمل حسین چشتی
مشاورت: مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد
مدیران اعزازی: طاہر مسعود، محمد سلیم مغل
مجلس ادارت: ساجد سعید، منیر احمد راشد
اشتہارات: محمد عرفان
نمائندہ امریکہ: عبدالرشید خان

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۶ | دسمبر ۱۹۹۱ء | جمادی الثانی / رجب ۱۴۱۲ھ | فون نمبر ۲۹۹۱۷۸ | قیمت ۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ، طابع: زاہد علی، مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ ڈی نورس روڈ سائٹ کراچی

حُسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے ______ ا د ا ر ہ ـ ۱۲
پہلی بات ______ ا د ا ر یـہ ـ ۱۳
بہ خدمت جناب ______ ا د ا ر ہ ـ ۱۴
کون سا مذہب سچا ہے ______ این بـلـوچ ـ ۱۸
لال گلاب ______ ڈاکٹر عارف ایوبی ـ ۲۵
مل جُل کے ساتھ رہنا ______ عبدالقادر ـ ۳۰
عظیم قائد ______ فاروق عادل ـ ۳۳
مُونچھوں کا کمال ______ اخگر انوار اعوان ـ ۳۹
شارجہ کپ ______ ضیاء الرحمٰن ضیاء ـ ۴۳
جوید دیاں گلاں ______ سلیم مُغل ـ ۴۶
گُدگُدے ______ منتخب لطائف ـ ۵۰
کوئز کہانی ______ اسامہ بن سلیم ـ ۵۳
سلیم واپس نہیں آئے گا ______ طاہر مسعود ـ ۵۹
ہے حقیقت کچھ ______ عقیل عباس جعفری ـ ۶۴
سردموت ______ منیر احمد راشد ـ ۶۹

حُسنِ ترتیب

۷۵۔ ساجد سعید ــــــــ اپنی دُنیا

۸۳۔ میرزا ادیب ــــــــ تتلی کا پَر

۸۸۔ جاوید عبدالکریم سحر ــــــــ ڈاکیہ

۸۹۔ آصف فرّخی ــــــــ چیزوں کی کہانی

۹۱۔ عبدالغفار ــــــــ ٹکٹ

۹۴۔ ثاقب محمود مصطفیٰ ــــــــ قلمکاروں کی شوخیاں

۹۶۔ ایاز محمود ــــــــ درِ حیرت

۱۰۰۔ محمد اقبال نجمی ــــــــ جگنو

۱۰۱۔ سیّد نظر زیدی ــــــــ آزادی

۱۰۸۔ عامر منیر ــــــــ مصلحت

۱۱۱۔ عبدالباسط ــــــــ سوئیٹر بُننے کا انوکھا مقابلہ

۱۱۴۔ سہیل احمد صدیقی ــــــــ گائے کی دستک

۱۱۶۔ محمد عمر احمد خان ــــــــ پناہ

۱۲۳۔ ننّھے ادیب ــــــــ قلم قتلے

۱۳۸۔ ھُما سلیم ــــــــ امّی ابّو کا صفحہ

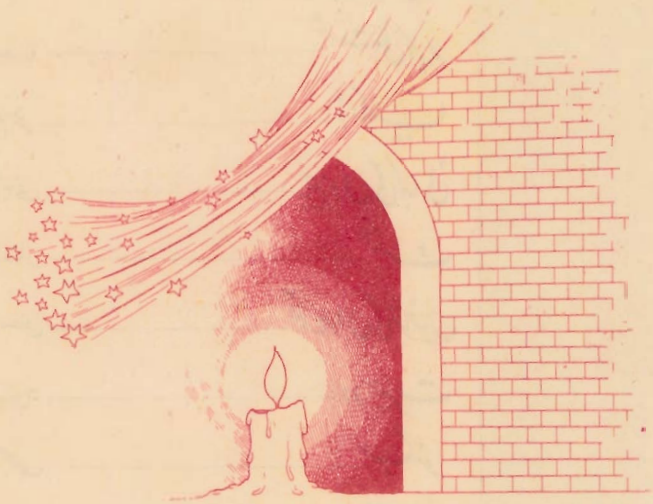

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام کیلئے حکومت کی طرف سے رسمی آئینی اعلان کیلئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی آئے تھے۔ ان کی آمد پر گورنر جنرل ہاؤس پر یونین جیک اور پاکستانی پرچم ساتھ ساتھ لہرائے گئے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد ماؤنٹ بیٹن دلی روانہ ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد کسی نے کہا۔

"جناب والا، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے چلے جانے کے بعد یونین جیک اتار دیا جائے۔"

قائداعظمؒ: (قدرے برہمی کے ساتھ) جھنڈے کو اتارنے کا صحیح وقت غروب آفتاب ہے۔ اس وقت ایسا کرنا ملک معظم کی توہین ہوگی جنہوں نے اس فرمان پر دستخط کئے ہیں جس کی رو سے پاکستان وجود میں آیا ہے۔

آپ نے ایسے لوگ ضرور دیکھے ہوں گے جن میں بھول جانے کی عادت ہوتی ہے اور یہ عادت ان میں اتنی پختہ ہوتی ہے کہ گزرے ہوئے دن کے واقعات انہیں یاد نہیں رہتے۔ جانے پہچانے چہرے انہیں اجنبی لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھار وہ اپنے گھر کا رستہ بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ حکماء اس مرض کو مرض نسیان کا نام دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں اس مرض میں صرف افراد ہی مبتلا نہیں ہوتے بسا اوقات اچھی بھلی قوموں کو بھی یہی نسیان کا مرض لاحق ہو جاتا ہے اور وہ اپنا ماضی، اپنے اسلاف کے کارنامے، اپنے بزرگوں کی خدمات، ان کی قربانیاں سب فراموش کر بیٹھتی ہیں۔ لیکن فرد اور قوم..... ان دونوں پہ ایک ہی مرض کا اثر جُدا جُدا ہوتا ہے۔ فرد کا حافظہ کمزور ہو تو اس کی ذات سے طرح طرح کے لطیفے منسوب ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے دوستوں میں مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے اور جب کسی قوم کی یادداشت میں ضعف آجائے تو تاریخ کے المیے جنم لیتے ہیں اور مؤرخ ایسی قوم کو کبھی معاف کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اگر آپ نے اپنی قومی تاریخ پڑھی ہے تو آپ کو یاد ہو گا کہ جب ہم انگریزوں کے غلام تھے تو علامہ اقبالؒ، شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی نے ہمیں ہمارا روشن ماضی یاد دلایا تھا۔ اسلاف کے کارنامے یاد دلائے تھے اور اس کے بعد ہی ہماری قوم میں یہ جرأت پیدا ہوئی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالے۔ پس پتا چلا کہ جس قوم کا حافظہ قوی ہوتا ہے وہ غلام قوم سے آزاد قوم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جرمنی اور جاپان اس کی زندہ مثالیں ہیں جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں شکست کھا کر اپنی شکست کو یاد رکھا اور آج ترقی یافتہ قوموں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ گویا ترقی کے لئے قوم کو فتح کے ساتھ اپنی شکست اور کامیابی کے ساتھ اپنی ناکامی کو بھی اپنے حافظے میں زندہ رکھنا چاہئے۔

آج ترقی کی دوڑ میں ہمارے پیچھے رہ جانے کی جہاں اور بہت سی وجوہات ہیں ان میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنا ماضی فراموش کر چکے ہیں۔ وہ روشن ماضی جس میں ہم نے دشمنوں سے لڑ کر آزادی حاصل کی تھی اور وہ تاریک ماضی جس میں ہم نے اپنی حماقتوں سے اپنا ایک بازو کٹوالیا تھا۔ ۴۷ء میں ہم آزاد ہوئے تھے اور ۷۱ء میں ہم دو ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ (اور آج بھی ہم مختلف قومیتوں کے نعرے لگاتے ہیں)۔ اگر ہمیں اپنی آزادی اور سالمیت کا تحفظ کرنا ہے تو اپنے قومی حافظے کو نسیان کے مرض سے نجات دلانا ہوگی اور ہمیں اپنی فتح اور شکست دونوں کو یاد رکھنا ہو گا۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

بہ خدمت جناب

عبدالقدوس قریشی، ضلع جہلم

کوئی بھی چیز مکمل ہو جائے تو وہ فنا ہو جاتی ہے اس لئے آنکھ مچولی میں بھی کچھ خامیاں ہیں .... مثلاً اشتہارات کی بھرمار سے بوریت ہوتی ہے۔

○ ...... آپ نے جو اصول بیان کیا ہے اس لحاظ سے تو پرچے میں خامیاں بہت ضروری ہیں۔ اشتہارات تو ہر رسالے کی مجبوری ہوتے ہیں۔

اے منان خرم بٹ، ریاض سعودی عرب

برائے مہربانی یہ بتائیں کہ آپ کے ذمہ کیا کام ہوتا ہے؟ صرف خطوط کے جوابات .... یا کوئی اور کام بھی۔

○ ...... چپکے سے یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ یہ کیوں جاننا چاہتے ہیں۔

ایک محبِ وطن

کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ہماری اس قوم کا انجام کیا ہوگا جس کا ہر فرد اپنے مفاد میں سوچتا ہے۔

○ ...... آپ کے طویل خط کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہماری قوم کا ہر فرد مفاد پرست ہے۔ نیک اور اچھے لوگ خاموشی سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں، اسی لئے ان کا پتا نہیں چلتا تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ معاشرہ بے غرض اور ایثار پسند لوگوں سے خالی ہو گیا ہے۔

میاں سید سفیان کاکاخیل، اسلام آباد

ایک بات یہ بتانی ہے کہ میں نے دو لڑکوں سے سگریٹ کی عادت چھڑوا دی ہے۔

○ ...... مبارک ہو آپ نے دو گھرانوں پہ احسان کیا۔ اور ہاں کہانیاں بھجوانے کے لئے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

نعیم خواجہ، لاہور

انکل! میری اور مجھ سے چھوٹی بہن صائمہ اور صائمہ سے چھوٹی بہن تہمینہ کی شرط لگی ہے کہ کس کی تحریر آنکھ مچولی میں چھپتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہم تینوں کی تحریریں چھاپیں گے۔

○ ..... شرط میں جو جیتے وہ ہمیں بھی مٹھائی کھلائے۔ اور آپ تینوں کی تحریریں ایک ساتھ چھپ گئیں تو شرط والی بات تو رہ ہی جائے گی۔

عابدہ خان، سرائے عالمگیر

آپ یورپ کے بچوں کے بارے میں تصویریں اور مضامین زیادہ چھاپتے ہیں حالانکہ آپ دیکھیں تو پاکستان میں ان سے بہتر صلاحیتوں کے بچے موجود ہیں۔

○ ..... بھئی ہم پاکستانی بچوں کے بارے میں بھی خاصا کچھ چھاپتے ہیں اور یورپ کے بچوں کے بارے میں معلوماتی مضامین چھاپنے میں کیا حرج ہے۔ بچے آخر بچے ہوتے ہیں۔

جشید الحسن جمیل شاہ صدیقی، ڈیرہ غازیخان

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میری خیریت کی پروا نہ کیجئے کیونکہ آنکھ مچولی والے تو ہمیشہ خیریت سے ہوتے ہیں لیکن انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ لکھاریوں پر کیا گزرتی ہے۔

○ ..... ہم آپ کے حال سے بے خبر نہیں ہیں۔ آپ یقیناً بہت اداس ہوں گے کیونکہ کہانی نہیں چھپی ہوگی۔ صبر اور مزید محنت سے میرے عزیز!

شازیہ ارم، پشاور

انکل! پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ اگر آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا اور میرے ٹوٹے دل کو جوڑنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔

○ ..... اپنے دل کو ذرا مضبوط بنائیے۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ دل کا ٹوٹنا اچھا نہیں ہوتا۔

سید مراد علی شاہ، ٹنڈو الہیار

آپ کی تحریک سے متاثر ہو کر میں نے بھی سگریٹ چھڑوانے کی مہم شروع کر رکھی ہے اور "سگریٹ نہ سلگائیں" والے اشتہار کو فوٹو اسٹیٹ کروا کے اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

○ ..... شاباش! آپ نے نیک کام کیا۔ خدا کرے آپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔

منیر احمد میرجت، میرپور

آپ رسالے میں ایک سلسلہ شروع کیجئے جس میں پاکستان کے ہر شہر کا باری باری تعارف کرائیے تاکہ اپنے وطن کے بارے میں ہماری معلومات بڑھ سکے۔

○ ..... تجویز اچھی ہے اور اس طرح کے کچھ مضامین ہم مختلف وقتوں میں شائع کرتے رہے ہیں۔

محسن جاوید، فاران موسائٹی کراچی

آپ کا رسالہ آنکھ مچولی سارے رسالوں سے اچھا ہے۔ خدا کرے یہ چمکتا رہے۔

○ ..... حوصلہ افزائی کا شکریہ اور آپ بھی اسی طرح ہمیں خط لکھتے رہیں۔

محمد فیصل یوسف، ناظم آباد، کراچی

رسالے میں جاسوسی کہانیوں کا بے حد فقدان ہے۔ ہر شمارے میں کم از کم دو پراسرار جاسوسی کہانیاں ضرور شائع کیا کریں۔

○ ..... آپ کے مشورے پر جلد ہی ہم ایک جاسوسی ناول شائع کریں گے۔ امید ہے آپ کی شکایت دور ہو جائے گی۔

راشد منہاس ثاقب، برجکلاں ضلع قصور

آج تک اپنے گاؤں برجکلاں کا نام رسالے میں نہیں پڑھا۔ میں اپنی بستی کا نام روشن کرنا چاہتا ہوں۔

○ ...... اپنی بستی کا نام روشن کرنے کی خواہش نیک ہے اور اس کے لئے آپ کو خوب محنت سے تعلیم حاصل کرنی چاہئے کیونکہ اسی طرح آپ اپنا اور اپنی بستی کا نام روشن کر سکتے ہیں۔

عمار الرحمٰن خان (؟)

انکل! آنکھ مچولی کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب آپ "سائنس فکشن نمبر" شائع کیجئے۔

○ ...... "سائنس فکشن نمبر" کے لئے آپ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں؟

نیلوفر امان، بنوں

رسالے میں "مفت مشورے" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیجئے جس میں آپ طبی مسائل پر مشورے دیجئے۔ مثلاً ہمارا پہلا سوال دانتوں کے بارے میں ہے کہ اسے کیسے صاف کریں۔

○ ...... طبی موضوعات پر مضامین تو شائع ہوتے رہتے ہیں، مشورے والی تجویز پر بھی غور کریں گے۔ جہاں تک دانتوں کی صفائی کا تعلق ہے تو ہمارا خیال ہے کہ آپ دانتوں کو ...... مگر ٹھہریئے اس کا جواب مشوروں والے کالم میں دیا جائے گا۔

محبوب عبدالرزاق، کراچی

رسالے میں مقابلہ مصوری شروع کیجئے اور ہاں ستمبر اور اکتوبر کے شمارے میں کوپن والا صفحہ کس وجہ سے غائب تھا۔

○ ...... مصوری کا مقابلہ شروع کیا جا چکا ہے اور کوپن والا صفحہ ...... ہم خود حیران ہیں کہ کہاں غائب ہو گیا۔

واصف سمیع، کوئٹہ

انکل آئی کیو روبوٹ بہت اچھا سلسلہ تھا۔ آپ نے اسے کیوں بند کر دیا؟

○ ...... بھئی آنکھ مچولی میں پرانے سلسلے بند اور نئے سلسلے شروع ہوتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آنکھ مچولی کو یکسانیت سے بچانا چاہتے ہیں۔

محمد نسیم رفیع (؟)

گرین گائیڈ اکیڈمی نے بہت اچھی اچھی کتابیں چھاپی ہیں۔ سید نظر زیدی کی سیرت طیبہ پر کتاب "سب سے بڑا انسان" تو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو اتنی پسند ہے کہ روز اسمبلی کے بعد اس کے اقتباسات سناتے ہیں۔

○ ...... آپ کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہم بہت ممنون ہیں۔ یہ کتاب واقعی اتنی اچھی ہے کہ اسے بچوں کو سنایا یا پڑھوایا جائے۔

شہلا یاسمین، واہ کینٹ

انکل! جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو وفاقی وزیر صحت امیر حیدر کاظمی کو سگریٹ پر پابندی لگانے کے لئے خط لکھا تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ نے جوش دلایا تھا دوسری یہ کہ ہماری کلاس کے ایک لڑکے کے بیگ سے سگریٹ نکلے تھے مگر وزیر صاحب نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔

○ ...... ممکن ہے وزیر صاحب کو آپ کا خط نہ ملا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے مطالبے کو وہ پورا نہ کر سکتے ہوں اسی لئے چپ سادھ لی گئی لیکن آپ ہمت نہ ہاریں اور اس مقصد کے لئے جو کچھ کر سکتی ہیں

ضرور کیجئے۔

انیلا اطہر، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

آپ میرا خط شائع کر دیں گے تو بہت مہربانی ہوگی ورنہ میں آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جاؤں گی۔

○ ..... آپ ناراض نہ ہوئیے۔ آپ کا خط شائع ہوگیا ..... لیکن خط میں کوئی بات تو ہونی ہی چاہئے۔

عاصم شہزاد خان، لاہور کینٹ

انکل! کیا "آنکھ مچولی" کے رنگین صفحات کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ میں رنگین اشتہاروں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ آخر رسالے میں اتنے زیادہ اشتہارات کی کیا ضرورت ہے؟

○ ..... بیٹے! اشتہارات جو ہوتے ہیں نا وہ کماؤ پوت ہوتے ہیں اور کماؤ پوت کو بھی کوئی گھر سے نکال سکتا ہے۔ رسالے میں رنگین صفحات تو ہوتے ہی ہیں۔

نجیب اللہ پرنس آف افغانستان، اکوڑہ خٹک

اگر میں عالمی ادب نمبر کے لئے فارسی سے کہانی ترجمہ کروں تو کیا آپ شائع کر دیں گے۔

○ ..... بھئی پرنس صاحب! پوچھنے کے بجائے جلد سے جلد افغانستان کی کسی اچھی سی کہانی کا ترجمہ بھیج دیجئے اور سنائیے۔ آپ کی حکومت کیسی چل رہی ہے۔

اسٹوری ٹائم

ریڈیو سے ہر شام 7:50 پر

احمد فوڈ انڈسٹریز کے تعاون سے

ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشن بچوں کے لئے پیش کرتے ہیں

کہانیوں کا ایک دلچسپ اور مزے دار سلسلہ

ہر شام کہانی ۔ ہر شام سہانی

کون سا مذہب سچا ہے؟

ابن بلوچ

اس دنیا میں جتنے بھی انسان رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مذہب کو مانتا ہے۔ اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت ..... یہ سب مذہب ہیں اور ان کے نام آپ نے سنے بھی ہوں گے، لیکن اس کے علاوہ بھی کئی مذہب ہیں جن کے متعلق آپ کچھ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ دنیا کے ان تمام مذہبوں کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں وہ مذہب آتے ہیں جن کی بنیاد وحی ہے، وحی اللہ تعالیٰ کی بات ہے جو وہ کسی پیغمبر کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔ اس لئے ان مذہبوں کو الہامی، مذاہب بھی کہا جاتا ہے۔ گویا ان مذاہب کے بارے میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ان کا بانی اللہ تعالیٰ ہے، کوئی انسان نہیں۔ اسلام، عیسائیت اور یہودیت الہامی مذاہب ہیں۔

دوسری قسم کے مذاہب وہ ہیں جن کے بانی ایسے لوگ ہیں جن کو عام انسانوں کی نسبت بہت اعلیٰ اور عظیم کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دیوتاؤں کے مذاہب ہیں یعنی ان کے بانی تھے تو عام انسانوں کی طرح لیکن ان کے ماننے والے یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ انسانوں کے بھیس میں خدا تھے یا وہ خدائی طاقت کے مالک تھے۔ ہندومت، بدھ مت، مجوسیت اور اس کے علاوہ دنیا کے لاتعداد چھوٹے مذاہب اسی قسم میں آتے ہیں۔

تیسری قسم کے مذہب کو عام طور پر مذہب نہیں، ازم، کہا جاتا ہے۔ اس کے ماننے والے نہ کسی خدا پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی ایسے انسان کو سچا سمجھتے ہیں جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ میرے پاس کوئی وحی آتی ہے یا میں خدائی طاقت کا مالک ہوں۔ گویا یہ مذہب پہلے مذاہب کے بالکل متضاد ہے۔ اور اس کا کام دنیا کے باقی مذہبوں کو ختم کرنا ہے۔ کمیونزم اور اس طرح کے دوسرے ازم، دراصل اسی قسم کے مذاہب ہیں۔

پہلی قسم کے مذاہب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان ایک محتاج اور کمزور مخلوق ہے۔ اسے کسی نے پیدا کیا ہے، وہ خود سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ دنیا، جس میں وہ رہ رہا ہے، اسے نہ اس نے بنایا ہے اور نہ ہی یہ خود بخود بن گئی ہے، بلکہ اسے کسی ایسی ہستی نے بنایا ہے جو انسان کی ضرورتوں کو بہت اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اسی لئے تو اس زمین پر انسان صدیوں سے اس طرح سے رہ رہا ہے کہ ہر چیز پر اس کی حکمرانی ہے۔ لیکن وہ حکمران ہو کر بھی بہت کمزور ہے۔ اسے بچے سے بڑا ہونے تک انتہائی توجہ اور نگرانی کی ضرورت ہے۔ طرح طرح کی بیماریاں اور خطرے اس کی جان کو ختم کر دینے کے درپے رہتے ہیں۔ وہ ان بیماریوں اور خطروں سے اگر کامیابی کے ساتھ لڑ بھی لے تو پھر بھی ایک دن اسے مرہی جانا ہے۔ وہ محتاج رہتا ہے کہ ہوا کے بغیر چند گھنٹے تو کیا چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر دن وہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے پر مجبور ہے۔ اس کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے کمزور اور ضرورت مند انسان کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی اور عام انسانوں کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ اس کی صحیح رہنمائی تو وہی ہستی کر سکتی ہے جس نے اسے بنایا ہے، اس دنیا کو بنایا ہے اور پھر اس میں وہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جس سے انسان صدیوں سے اس میں رہ رہا ہے۔ یہ مذاہب اس ہستی کو اللہ یا خدا کا نام دیتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں یقین رکھتے ہیں کہ اس نے ہمیں پیدا ہی نہیں کیا بلکہ ہماری رہنمائی بھی کی ہے اور یہ رہنمائی وحی کے ذریعے سے کی ہے۔ یہ وحی، اس نے ہم تک اپنے کچھ پسندیدہ انسانوں کے ذریعہ پہنچائی ہے۔ اس لئے خدا کے ان پسندیدہ بندوں کو خدا کا پیغام پہنچانے والے یعنی پیغمبر کہتے ہیں۔ عربی میں پیغمبر کو رسول اور نبی کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی انسان حقیقت کو جاننا چاہتا ہے تو اسے اللہ کے پیغمبروں یا رسولوں کی وحی پر ایمان لانا ہو گا۔ اس حد تک تو پہلی قسم

کے مذاہب، جنہیں ہم الہامی مذاہب کہتے ہیں، ایک دوسرے سے اتفاق کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے مذاہب کے لوگ عجیب بات کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو مانتے ہیں کہ انسان ایک کمزور اور محتاج مخلوق ہے لیکن دوسری طرف وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کچھ انسان خدائی طاقت کے مالک ہوتے ہیں

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان انسانوں نے اپنی زندگی میں کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خدائی طاقت کے مالک ہیں یا وہ دیوتا ہیں ایسی باتیں ان لوگوں کے مرنے کے کئی سال بعد مشہور ہوئیں۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کو دیوتا یا خدائی طاقت کا مالک سمجھا جاتا تھا، وہ عام انسانوں کی طرح جیئے۔ زندگی میں تکلیفیں برداشت کیں، انہیں دکھ اور غم سہنا پڑے اور پھر وہ موت کے منہ میں بھی جانے سے بچ نہ سکے۔ اس لئے یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ خدائی طاقت رکھتے ہوئے بھی دوسروں کے ظلم کا شکار ہوئے۔ اگر وہ کچھ بھی طاقت رکھتے ہوتے تو ان کے ساتھ کوئی بھی زیادتی نہ کرتا۔ یا کم از کم وہ موت سے ہی بچ نکلتے یا وہ عام انسانوں کی نسبت کچھ سال زیادہ زندہ رہتے۔ لیکن ہم جانتے ہیں اس طرح کی کوئی بات ان میں نہ تھی ۔ ان مذہبوں کے جھوٹا ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ کہ کسی بھی شخص کو آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان دیوتاؤں نے اصل میں کیا کہا تھا۔ ؟ حتیٰ کہ ان مذہبوں کے ماننے والوں کو بھی صحیح طرح یہ معلوم نہیں کہ ان کی تعلیمات کیا تھیں۔ اس قسم کے مذہبوں میں سب سے پرانا اور بڑا مذہب ہندومت ہے۔ لیکن آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ ہندومت کا بانی کون تھا؟ اس کی مذہبی کتابوں کا مصنف (لکھنے والا) کون تھا؟ اس مذہب کی عبادات کا حکم کس نے دیا؟ حتیٰ کہ ہندو عالم یہ بھی نہیں بتاسکے کہ ایک ہندو کو کن کن باتوں پر ایمان لانا چاہئے۔ اس بارے میں بھی ہر ایک کی بات دوسرے سے مختلف ہے۔

ان مذاہب کو نہ ماننے کی تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں۔ بے شمار ایسی باتیں ہیں جن پر کوئی عقلمند شخص ایمان نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً ان سب مذہبوں میں بت پرستی ایک مشترک چیز ہے۔ اب کوئی بھی سمجھدار شخص یہ کیسے مان سکتا ہے کہ بت کی عبادت کرنے سے دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور ذہن کو سکون ملتا ہے۔

تیسری قسم کے مذاہب کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ خدا کو نہیں مانتے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے کہ خدا نہیں ہے، بلکہ وہ یہ بات مخالفت اور ضد میں آکر کرتے ہیں۔ ہوا یوں کہ جب سائنس کی ترقی سے انسان کو زمین اور آسمان کے متعلق مختلف باتیں معلوم ہوئیں تو اس وقت کے عیسائی پادریوں نے اس کی سخت مخالفت کی کیونکہ یہ نئی دریافتیں ان کی خود بنائی ہوئی باتوں کے بالکل خلاف تھیں یہ باتیں انہوں نے اپنی مذہبی کتاب بائیبل، میں لکھی ہوئی تھیں۔ مثلاً ہم آپ کو

وہ پہلی بات بتاتے ہیں جس میں عیسائی پادریوں اور سائنس دانوں میں دشمنی کا آغاز ہوا تھا۔ بائبل کے اندر یہ لکھا ہوا ہے تمام ستارے زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ لیکن کوپرنیکس نامی مشہور سائنس دان نے یہ ثابت کر دیا کہ زمین دوسرے کئی سیاروں کے ساتھ مل کر سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ عیسائی پادریوں کے پاس کوپرنیکس کی بات کو غلط ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں تھی۔ اس موقع پر انہیں چاہئے تھا کہ وہ یہ مان لیتے کہ واقعی زمین سورج کے گرد گھومتی ہے لیکن انہوں نے کوپرنیکس کو پھانسی دلوادی۔ اس وقت عیسائی پادریوں کا حکومت پر بہت رعب ہوا کرتا تھا۔ اس واقعے کے بعد جب بھی کوئی سائنس دان بائبل کے خلاف یا ان عیسائی پادریوں کی کہی باتوں کے خلاف کوئی چیز ثابت کر دیتا تو یہ پادری حکومت کو کہہ کر اس سائنس دان کو خوب سزا دلواتے۔ اب سائنس دانوں کو یقین ہو چکا تھا کہ جب تک یہ عیسائی پادری اور ان کی حمایتی حکومت رہے گی، نہ سائنس ترقی کر سکتی ہے اور نہ وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے دونوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے کی حکومتیں بھی عیسائی پادریوں کی طرح بڑی ظالم تھیں۔ لوگ پہلے ہی ان سے اکتائے ہوئے تھے اور ان کے ظلم سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ لوگوں کو سائنس دانوں کی باتیں سچی معلوم ہوتی تھیں۔ چنانچہ سائنس دانوں اور ان کے حمایتیوں نے عیسائی پادریوں کو ختم کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ وہ خدا کا ہی انکار کر دیں۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ یعنی جب خدا ہی نہیں ہو گا تو پھر وحی کہاں سے آئے گی اور رسول کیسے سچے ہو سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف عیسائیت بلکہ تمام مذاہب کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اور ان لوگوں کو من مانی کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ خدا سے انکار کی بڑی اور اصل وجہ یہی تھی!

خدا سے انکار سے بڑھ کر بے عقلی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک تنکا بھی خود بخود نہیں بن سکتا تو یہ اتنی بڑی دنیا، سورج، چاند، ستارے، یہ سب خود بخود کیسے بن سکتے ہیں! بے شک ان کو بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ جو ان سب چیزوں کو بنانے والا ہی نہیں بلکہ انہیں چلانے والا اور ان کو کنٹرول کرنے والا بھی ہے۔

الہامی مذاہب کی حقیقت:۔

اوپر کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ دوسری اور تیسری قسم کے مذاہب کی بنیاد ہی غلط ہے۔ یعنی نہ یہ مانا جا سکتا ہے کہ انسان خدا ہو سکتا ہے یا اس کے پاس خدائی طاقت ہے اور نہ ہی اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ زمین، سورج، چاند ستارے خود بخود بن گئے اور خود بخود ہی اپنے کاموں میں لگ گئے۔ ان کو بنانے والا اور چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد پہلی قسم کے مذاہب رہ جاتے ہیں، ہم

آپ کو بتا چکے ہیں کہ انہیں الہامی مذاہب کہتے ہیں۔

الہامی مذاہب میں سے اس وقت صرف تین مذاہب باقی ہیں۔ اسلام، عیسائیت اور یہودیت۔ ان تینوں مذاہب کے پاس وہ کتابیں ہیں جو اللہ نے اپنے رسولوں پر نازل کیں ہیں۔ عیسائی انجیل پر ایمان رکھتے ہیں، یہودی توریت کو اللہ کی نازل کردہ کتاب سمجھتے ہیں اور قرآن کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ پہلی دو کتابیں۔ انجیل اور توریت اپنی اصل حالت میں باقی نہیں ہیں۔ اصل کتابیں تو سینکڑوں سال پہلے ہی ضائع ہو گئی تھیں۔ بعد میں مختلف لوگوں نے اپنی یادداشت سے انہیں اپنی اپنی زبانوں میں لکھ لیا۔ ان کتابوں میں بھی بعد میں بہت سی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ یہ تبدیلیاں اتنی زیادہ ہیں کہ یہ معلوم کرنا آسان نہیں کہ کون سی باتیں اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی ہیں اور کون سی باتیں لوگوں نے اپنے پاس سے داخل کر دی ہیں، اس بات کو یہودی اور عیسائی، دونوں مانتے ہیں کہ ان کی مذہبی کتابیں اصلی نہیں ہیں بلکہ یہ مختلف انسانوں کی لکھی ہوئی ہیں اور ان میں تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ قرآن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ جس طرح نازل ہوا اسی طرح موجود ہے۔ مسلمان ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ قرآن دنیا کی واحد الہامی کتاب ہے جو اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اور اس میں ایک نقطے کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن دنیا کی واحد الہامی کتاب ہے، جس سے ہم اللہ تعالیٰ کی کہی ہوئی باتیں جان سکتے ہیں۔ اور اسلام ہی دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جسے الہامی کہا جاسکتا ہے۔ باقی دونوں مذاہب اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہے کیونکہ ان میں بہت ساری باتیں نئی داخل کر دی گئی ہیں اور بہت ساری چیزیں بالکل ختم کر دی گئی ہیں۔ اور ان مذاہب کے لوگوں کو اپنی کتابوں کے اندر اس طرح کی تبدیلیوں سے کوئی انکار بھی نہیں ہے۔

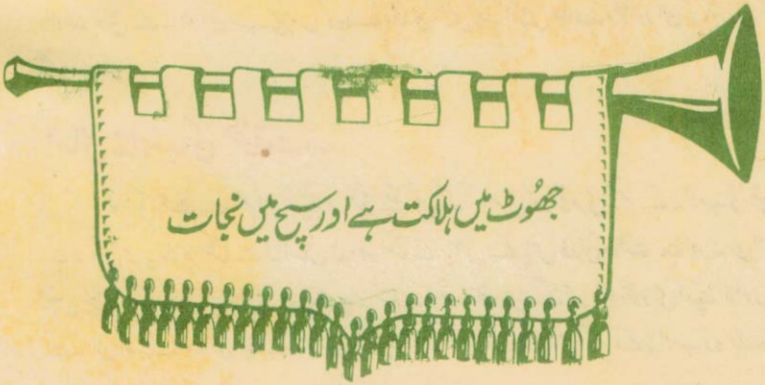

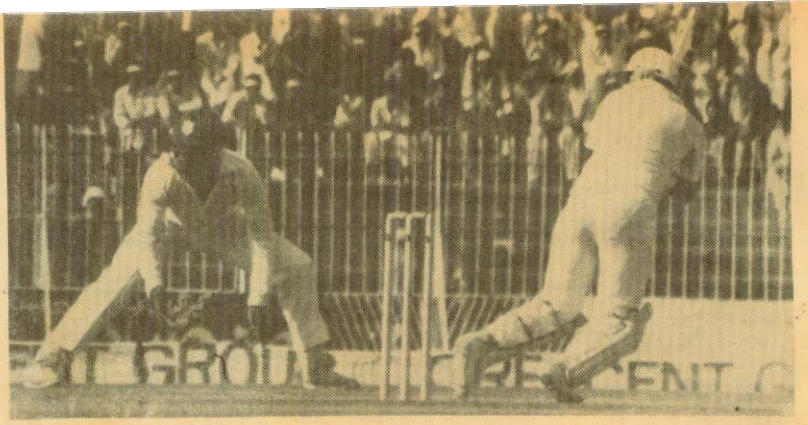

شارجہ کپ

کھیل یا تماشہ

آنکھوں دیکھا حال ضیاء الرحمٰن ضیاء کے قلم سے

شارجہ میں پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم ٹورنامنٹ کیسے جیت گئی ؟
اپنی ٹیم کے اعلیٰ کھیل کی وجہ سے ..... ؟
ویسٹ انڈیز کی ٹیم میں ان کے چار بڑے کھلاڑیوں کی غیر موجودگی کے سبب ..... ؟
بھارتی ٹیم میں تجربہ کار کھلاڑیوں کے بجائے نوجوانوں کھلاڑیوں کو موقع دینے کی وجہ سے ..... ؟
یا پھر سری لنکا کے امپائروں کے پاکستان کے حق میں فیصلہ دینے سے ..... ؟

جب ملک کی عزت کا مسئلہ ہوتا ہے تو ہر ملک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک کے بہترین دستیاب کھلاڑی میدان میں اتارے۔ شارجہ میں بھی ہر ملک کی سلیکشن کمیٹی نے یہی کیا۔ پھر بھی کئی اچھے کھلاڑی سلیکٹرز کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ جب ملکوں کے درمیان مقابلے ہوتے ہیں تو منتخب نہ کئے جانے والے کھلاڑی فراموش کر دیئے جاتے ہیں اور ملک کی نمائندگی صرف وہی کھلاڑی کرتے ہیں جنہیں

ٹیم میں جگہ ملتی ہے۔ شارجہ میں بھی موجود تمام کھلاڑیوں نے اپنے اپنے ملک کا قومی پرچم سربلند کرنے کی کوشش کی۔

سری لنکا کے امپائروں سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ انہوں نے پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان میچ میں پاکستان کی باری کے ۴۹ ویں اوور میں پانچ گیندوں پر اوور ختم کر دیا۔ انہوں نے ویسٹ انڈیز اور بھارت کے درمیان مقابلے میں ویسٹ انڈیز کے پانچ کھلاڑیوں کو ایل بی ڈبلیو دے کر ایک باری میں سب سے زیادہ ایل بی ڈبلیو کے عالمی ریکارڈ کو برابر کیا تو ویسٹ انڈیز نے کسی شدید ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن فائنل میں جب عاقب جاوید نے ایل بی ڈبلیو کے ذریعے اپنی ہیٹ ٹرک مکمل کی تو بھارتیوں نے شور مچا دیا۔ یہاں پاکستان میں بھی کچھ لوگوں نے شارجہ میں پاکستان کی فتح کو سری لنکا کے امپائروں سے منسوب کیا لیکن سری لنکا کے امپائروں نے جان بوجھ کر غلطیاں نہیں کیں ان کی چند غلطیوں کی وجہ سے پاکستان کو بھی نقصان پہنچا۔ ابتداء میں یقیناً پاکستان کے کھلاڑی مطلوبہ معیار پر پورے نہ اتر سکے لیکن بعد کے میچوں میں انہوں نے جس شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اسی کے سبب وہ شارجہ کپ ٹورنامنٹ جیتنے میں کامیاب ہوئے۔

شارجہ میں پاکستان کی فتح کا سبب وہاں موجود پاکستانی شائقین کا زبردست جوش و خروش تھا۔ شارجہ اور اردگرد کی دیگر ریاستوں میں، پاکستانیوں سے زیادہ بھارتی باشندے آباد ہیں۔ وہاں کے تجارتی اداروں پر بھی بھارتی باشندوں کا کنٹرول ہے۔ پھر اس مرتبہ وہاں رہنے والے بھارتی تاجروں نے ٹورنامنٹ جیتنے پر اپنی ٹیم کو دس لاکھ روپے دینے کا اعلان بھی کیا تھا اس کے علاوہ بھارتی حکومت اور بھارت کے دیگر تجارتی اداروں نے ہر میچ میں فتح پر بھاری رقوم مقرر کیں۔ لیکن ان میں پاکستانیوں جیسا ولولہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ پاکستان کے میچ کے دن شارجہ اور اس کے قریب ریاستوں سے لوگ وہاں خصوصی طور پر آتے تھے۔ بہت سے لوگوں کو تو اپنی ایک دن کی تنخواہ بھی کٹوانا پڑتی تھی۔ وہاں ٹکٹ خاصے مہنگے تھے۔ ایک عام دن کے ٹکٹ کی کم از کم قیمت چالیس درہم یعنی تقریباً ۲۸۰ پاکستانی روپے مقرر کی گئی تھی۔ پھر اسٹیڈیم پہنچنے کیلئے انہیں ٹیکسیوں کا بھاری کرایہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا (کیونکہ وہاں پبلک بسیں نہیں چلتیں) لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود پاکستانی وہاں کثیر تعداد میں آتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ٹیم کو داد دے دیں گے تو اسے ضرور فتح نصیب ہوگی۔ جب پاکستان کی ٹیم اپنے پہلے راؤنڈ کے دو میچ ہار گئی، تب بھی لوگوں کے حوصلے بلند تھے۔ وہ پُرعزم تھے کہ آئندہ میچوں میں پاکستانی ٹیم اچھے کھیل کا مظاہرہ کر کے اس بار بھی ولز ٹرافی انٹرنیشنل جیت لے گی اور شارجہ میں ۱۹۸۵ء سے ہر ٹورنامنٹ جیتنے کی روایت برقرار رکھے گی۔

بچوں میں جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ رات ہی سے میچ دیکھنے کی تیاریاں شروع کر دیتے تھے۔ صبح اپنے والدین سے پہلے سو کر اٹھ جاتے۔ میدان میں داخل ہونے کے لئے لمبی لمبی قطاروں میں شامل ہوتے۔ میدان میں بھی وہ نظم و ضبط کا شاندار مظاہرہ کرتے۔ جب کوئی پاکستانی کھلاڑی چوکا یا چھکا لگاتا، کوئی بالر وکٹ لیتا یا کوئی فیلڈر اچھی فیلڈنگ کرتا تو وہ بڑے جوش و جذبے سے اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ پاکستانی پرچم فضا میں بلند کرتے۔ عام اسٹینڈز کی بے آرام نشستوں پر بھی وہ بے آرام نہ ہوتے۔ بلکہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے ہمراہ وہ میچ کا لطف اٹھانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ میچ کے دوران پاکستان کے حق میں وہ فلک شگاف نعرے لگاتے کہ کم تعداد میں ہونے کے باوجود، حریف پر بھاری رہتے۔

میچ ختم ہونے کے بعد بغیر کوئی ہنگامہ کئے، مثالی نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے، قطار بنا کر میدان سے باہر نکلتے۔ کھلاڑیوں کے آٹوگراف لینے کے لئے بھی وہ قطار میں نظر آتے تھے۔ ایک دو مرتبہ میدان میں بھی ایک دو بچے داخل ہوگئے لیکن امپائر کے منع کرنے پر وہ کھلاڑیوں کو شاباش دے کر فوراً ہی اپنے اپنے انکلوژر میں چلے گئے۔ پولیس کو مزاحمت کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہاں کے شہری اپنی پولیس کا ضرورت سے زیادہ احترام کرتے ہیں اور پولیس بھی بلاوجہ شہریوں کو تنگ نہیں کرتی لیکن جو شخص قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ خواہ کتنے ہی بڑے عہدے پر فائز ہو، وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔

پاکستان کو فتح ان ہی پُرجوش پاکستانی شائقین کے طفیل نصیب ہوئی۔ پاکستان میں پاکستانی ٹیم کو اتنی داد نہیں ملتی جتنی شارجہ میں مقیم پاکستانیوں سے اسے ملتی ہے۔

دو چھوٹی لڑکیوں کے دعا مانگنے کا منظر کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان میچ کھیلا جا رہا تھا۔ پاکستان کی فتح کے امکانات کم تھے۔ بہت سے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں بلند ہوئے۔ کیمرے کی آنکھ دوپٹے سے سر ڈھکی ہوئی اور اللہ کے حضور دعا کرتی ہوئی دو بہنوں پر مرکوز ہوگئی۔ اس میچ میں شکست کی صورت میں پاکستان ٹورنامنٹ ہی سے باہر ہو جاتا اور تمام پاکستانیوں کو بڑی ذلت اٹھانا پڑتی لیکن وقار یونس نے میچ کی آخری گیند پر ایان بشپ کو بولڈ کر کے نہ صرف ہارتے ہارتے پاکستان کو جتا دیا بلکہ ٹورنامنٹ میں دم توڑتی امیدوں کو بھی زندگی عطا کر دی۔ لڑکیوں کی دعائیں قبول ہوئیں اور پھر پاکستان ٹورنامنٹ جیت گیا۔

آپ ٹورنامنٹ کے ہر منظر کو بھول سکتے ہیں لیکن ان لڑکیوں کے فضا میں بلند ہاتھ، ہمیشہ یاد رہیں گے۔

جویداں گلاں

ملاقات: سلیم مغل

آج سے کچھ عرصہ قبل تک ہم سمجھتے تھے کہ کارٹون، محض شوخ اور مزاحیہ سی تصویر کا نام ہے، یا شاید ناک لمبی کر دینے اور انسانی چہرے کا حلیہ بگاڑ دینے کو کارٹون کہتے ہیں۔ وقت نے ثابت کیا کہ کارٹون اس کے علاوہ بھی کچھ ہے بلکہ بہت کچھ ہے۔

ایسی بہت سی باتیں جنہیں ہم لمبے چوڑے مضمون یا کالم میں بھی بیان نہ کر سکیں، کارٹون کی شوخ لکیریں انہی باتوں کو ایک لمحے میں ذہن پر نقش کر دیتی ہیں۔ پیغام کو مؤثر طریقے سے ذہنوں تک پہنچانے کے لئے کارٹون کو اہم ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان میں فن کارٹون سے وابستہ بہت سے معروف لوگ ہیں، لیکن اس فن میں جو مہارت جاوید اقبال کے حصے میں آئی وہ دوسروں کے ہاں کم کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ جاوید اقبال کے بنائے ہوئے خوبصورت اور شوخ کارٹون دیکھتے ہی ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگتی ہے۔ جاوید کے کارٹون میں خیال کی باریکی بھی ہوتی ہے اور لکیر کی شوخی بھی، اس لئے یہ بے حد پسند بھی کئے جاتے ہیں۔

ہمارے اکثر ساتھیوں نے ہمیں خط لکھ کر یہ فرمائش کی کہ آپ جاوید اقبال کا انٹرویو شائع کیجئے۔

اسے حسن اتفاق کہئے کہ جاوید اقبال کا انٹرویو ہمارے پاس آڈیو کیسٹ میں پہلے سے موجود تھا۔ یہ انٹرویو ہم نے ان سے اس وقت کیا تھا جب وہ روزنامہ نوائے وقت میں ملازم تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ انٹرویو زندگی بھر ہماری ذاتی میراث رہے گا مگر اب اپنے ساتھیوں کی بے حد فرمائش پر ہم اس

عالمی شہرت یافتہ کارٹونسٹ

جاوید اقبال

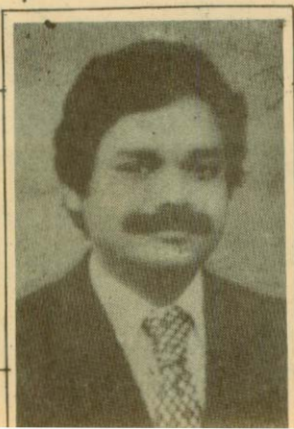

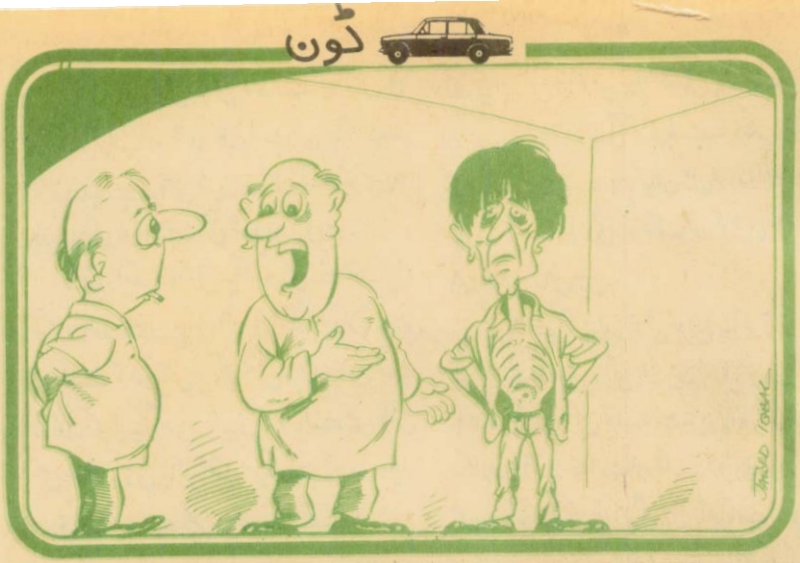

یہ مجنوں منہیں بلکہ جامعہ کا طالبعلم ہے، حاشیہ میں رہتا ہے کھانا بھی وہیں کھاتا ہے

طویل انٹرویو کے کچھ حصوں کو آنکھ مچولی کی نذر کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آنکھ مچولی میں اپنے انٹرویو کے اقتباس دیکھ کر خود جاوید اقبال کو بھی خوشگوار حیرت ہو۔ جاوید اقبال سے یہ پوری گفتگو پنجابی زبان میں ہوئی تھی اس لئے ہم نے کہیں کہیں ان کے پنجابی جملوں کو بھی آپ کی دلچسپی کی خاطر شامل کر دیا ہے۔

گفتگو سے اقتباس

"لو جی اسیں پیدا تے جموں کشمیر ہوئے۔"

"لو جی ہم پیدا تو جموں کشمیر میں ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں۔" اس کے بعد ہجرت کر کے ہم لوگ سیالکوٹ آگئے۔ پھر وہیں روایتی اردو میڈیم اسکول میں "پھنجے بے کر" (زمین پر بیٹھ کر) پانچویں جماعت پاس کی۔ پھر ایک گورنمنٹ ہائی اسکول سے دسویں پاس کی، اسکول کے بعد کالج میں داخلہ لیا۔ سیالکوٹ میں دو ہی لڑکوں کے کالج تھے۔ میں نے دونوں باری باری چکھے، انٹر اسلامیہ کالج سے کیا۔ بی اے دوسرے کالج سے کرنا تھا، جو نہ کر سکا اور لاہور آگیا۔ پھر پلٹ کر سیالکوٹ نہیں گیا۔ ۱۹۶۴ء کے بعد سے میرا مستقل ٹھکانہ لاہور ہی ہے۔ یہاں آکر میں نے اچھے کالجوں کا انتخاب کیا اور باری باری سب چکھے۔ نیشنل کالج میں بھی پڑھتا رہا۔ بعد میں جامعہ پنجاب کے فائین آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۰ء میں تعلیم سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ پھر میرا رابطہ آوارہ گردی سے شروع ہو گیا۔ آوارہ گردی حسب توفیق اب بھی کرتا رہتا ہوں۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جس کی ڈرائنگ خراب ہو "وہ کارٹونسٹ بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنی ضرورت کارٹونسٹ کو Perfcetion کی ہوتی ہے، اتنی شاید ہی کسی ہو۔

مجھے ڈرائنگ کا شوق سیالکوٹ ہی سے تھا۔ اپنی کتابوں اور کاپیوں پر ہر وقت ڈرائنگ کیا کرتا۔ جو چیز سامنے آجاتی اس پر کچھ نقش و نگار بنا دیتا تھا۔ جو کوئی بھی اپنے گھر پر سفیدی کرواتا اسے میں بالکل بھی معاف نہیں کیا کرتا تھا۔ سیالکوٹ کے در و دیوار میری ڈرائنگ سے بھرے ہوئے تھے۔

مجھے کارٹونسٹ بنانے کے ذمہ دار ہمارے دوست محمود شام ہیں۔ جو پہلے نوائے وقت میں ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم کارٹون بناؤ۔ میں نے منع کر دیا کہ مجھے کارٹون بنانے نہیں آتے۔ مگر ان کے اصرار پر میں نے کارٹون بنایا جو بعد میں شائع ہوا اور بے حد پسند کیا گیا۔ اس طرح گویا کارٹون بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا

وحشی مار ہروی مرحوم کے پاس چاند میں، میں نے زندگی کی پہلی ملازمت کی۔ مجھے وہاں سے ساٹھ روپے مہینہ ملا کرتے تھے۔ مگر پہلی بار ساٹھ روپے حاصل کر کے جو خوشی ہوئی تھی۔ اس کا کچھ نہ پوچھئے۔ اب میں لاکھوں بھی کماؤں تو اتنی خوشی نہیں ہو سکتی۔

چھوٹی عمر میں سیالکوٹ کے ایک رسالے علم و ادب میں کام کیا تھا۔ وہ مجھے ۸ روپے ماہانہ دیتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے یہ احساس تھا کہ یہ بڑا استحصال پسند ایڈیٹر ہے اور میرے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ دیگر رسائل جن کے لئے میں نے کام کیا ان میں اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، زندگی، دھنک اور کراچی کا معیار بطور خاص شامل ہیں۔

میں بہت شوخ اور خوش مزاج ہوا کرتا تھا، مگر یار..... پھر شادی ہو گئی؟۔ چند سال ہوئے میں بہت ہی خوش مزاج تھا۔ بہت ہی زیادہ، مگر شادی کے بعد فرق پڑ جاتا ہے اور اگر یہ فرق باہر کی زندگی میں نہ آئے تو گھریلو زندگی میں آجاتا ہے۔ ویسے میری بیوی بہت خوش مزاج ہے اور میری کمی کو پورا کر رہی ہے۔

میں مقابلوں میں حصہ لینے سے گھبراتا ہوں اور کتراتا بھی۔ اپنے ملک میں تو مقابلہ ہے ہی نہیں۔ بہت کم کارٹونسٹ ہیں۔ عزیز صاحب سیاسی کارٹون بناتے تھے مگر وہ غائب ہو گئے؟ پھر زیدی صاحب تھے یا نجمی صاحب ہیں۔ بقیہ لوگوں میں سیاسی کارٹون بنانے والے کم ہیں۔ زیادہ تر سماجی مسائل کو کارٹون کا موضوع بناتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں اس فضا میں مقابلہ کس سے ہو؟۔ ویسے بھی میں کسر نفسی کا قائل ہوں مقابلے کو مناسب نہیں سمجھتا۔

کارٹون کا خیال میرا اپنا ہوتا ہے۔ خلصتاً اپنا ہوتا ہے۔ کہیں اور سے نہیں لیتا۔ تعلیم ہمارا بنیادی مسئلہ ہے اور بنیادی مسئلہ تو مجھ سے بچ کر کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے تعلیم یا تعلیمی

اداروں پر بھی بہت سے کارٹون بنائے ہیں۔
کارٹون پر میری پہلی کتاب کا نام تھا "بلا عنوان" اس کا مجھے عنوان ہی نہیں ملا۔ ویسے بھی بڑی بری کتاب تھی مجھے پسند نہیں آئی۔ پرنٹنگ وغیرہ اچھی نہیں تھی اس لئے میں نے ضائع کر دی۔ میری دوسری کتاب تھی Laugh in یہ انگریزی کی چھوٹی سی کتاب تھی۔ میرے کراچی کے دوستوں نے حوصلہ افزائی کی اس طرح یہ کتاب آگئی۔ پھر تو مجھے چسکا لگ گیا۔ پھر Loughing Gallery پھر "ففٹی ففٹی" پھر "ماڈرن ابن بطوطہ" یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔ میرے لئے کتاب شائع کرنا آسان ہے، اگلے روز کا کارٹون بنانا زیادہ مشکل ہے۔

پاکستانی کارٹونسٹوں میں مجھے زیدی صاحب کی لائن ہمیشہ پسند رہی،

اس شعبے میں میرا کوئی استاد نہیں۔
میں بے استادا ہوں۔ بس کچھ ڈرائنگ کا شوق اور کچھ آوارہ گردی یہی میرے استاد ہیں۔ اس طرح میرا کوئی شاگرد بھی نہیں سچ یہ ہے کہ سکھانے کے لئے وقت دینا پڑتا ہے۔ وقت میں دے نہیں سکتا۔ اس پروفیشن سے انصاف نہ کرسکوں تو شاگرد پالنے کا کیا فائدہ؟۔

آج کل کے نوجوانوں

میں حس مزاح بہت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ابھی بے فکرے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں بڑی ذہانت بڑا اسپارک ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان میں Com mon Sence ہو نہ ہو، کوئی اور سینس خواہ نہ ہو لیکن Humer Sence بہت ہے۔ اگر آپ ان کی رہنمائی ٹھیک طرف کر دیں تو ہمارا ملک بڑی شے بن جائے گا۔

میرے عزائم تو یہ تھے کہ میں امریکہ جاکر انیمیشن (کارٹون فلم) کی تربیت لے کر آؤں مگر گھر والوں نے کہا کہ یا تو شادی کروالو یا امریکہ چلے جاؤ۔ "بس کی دساں، میں ویاہ کرالیا تے ایتھئی جوگا ہوگیا۔"
"بس کیا بتاؤں شادی کروالی اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔"
لیکن اب بھی عزائم یہی ہیں کہ امریکہ جاؤں اور انیمیشن (کارٹون فلم) کی تربیت لے کر آؤں

میری نظری میں دنیا کا سب سے اچھا کارٹونسٹ شالز ہے۔ مونٹریال میں انٹرنیشنل نمائش ہوئی تھی۔ موضوع تھا "مزاح" میں نے بھی دو کارٹون بھجوائے تھے جو شائع ہوگئے۔ نمائش میں سب سے اچھے کارٹون امریکہ کے شالز کے تھے۔

اپنے فن کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ نوجوان اس طرف ضرور آئیں میدان خالی ہے۔ اگر کسی میں Talent ہے تو وہ ضرور آئے۔ اس شعبے میں آگے نکلنے کے امکان بہت زیادہ ہیں۔ اور یوں بھی آنے والا وقت اسی شعبے کی برتری کا ہے۔

چٹکلے

انتخاب ...... دانش انجم، ذیشان انجم

جہنم میں جاؤ

بیوی ...... آج آپ دوپہر ہی میں دفتر سے آگئے۔

شوہر ...... میرا افسر آج اچانک غصے میں آگیا کہنے لگا جہنم میں جاؤ۔

بیوی ...... پھر تم نے کیا کیا؟

شوہر ...... کرتا کیا فوراً یہاں آگیا۔

تین عینکیں

پہلا آدمی (دوسرے سے) ...... یہ تم نے یہ تین عینکیں کیوں رکھی ہوئی ہیں؟

دوسرا آدمی ...... جناب ایک دور کی نظر کی دوسری نزدیک کی۔

پہلا آدمی ...... اور تیسری؟

دوسرا آدمی ...... جناب یہ دیکھنے کے لئے کہ نزدیک کی عینک کون سی ہے اور دور کی کون سی۔

دوسرا مصرعہ

ایک مشہور شاعر نے مشاعرے میں اپنی تازہ غزل کا پہلا مصرع پیش کیا۔

دل سی نایاب شے فدا کر دی

سامعین میں سے کسی نے دوسرا مصرع پڑھ کر شعر اس طرح سے مکمل کر دیا۔

بے وقوفی کی انتہا کر دی

بیماری

پروفیسر صاحب کو نوکر نے اطلاع دی کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں پروفیسر نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کرلیں اور کہا کہ ان سے کہہ دو آج میں بیمار ہوں کسی سے نہیں مل سکتا۔

بغیر ٹکٹ

ایک آدمی ریل میں بہت دیر سے کھڑا ہوا تھا ایک آدمی سے رہا نہ گیا وہ کہنے لگا "بھائی میرے! تم اتنی دیر سے کھڑے ہوئے ہو۔ بیٹھ کیوں نہیں جاتے" وہ آدمی کہنے لگا "ریل میں بغیر ٹکٹ بیٹھنا منع ہے۔

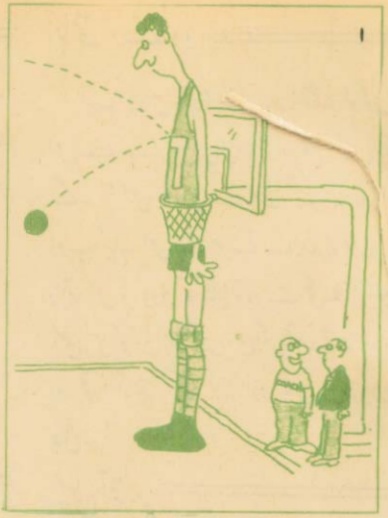

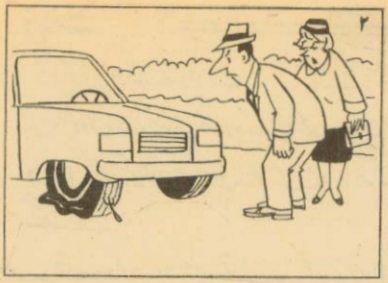

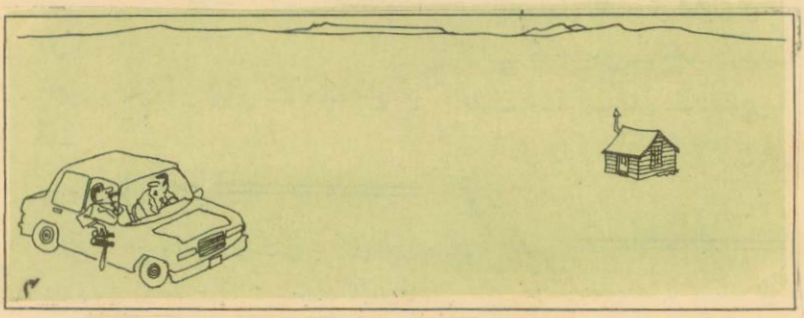

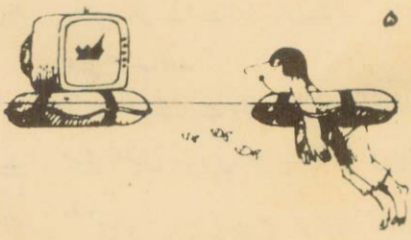

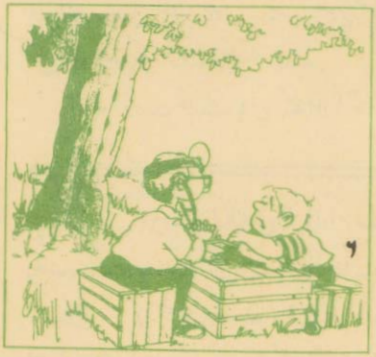

ان تمام کارٹونز کے کیپشن لکھئے۔ بے ساختہ اور دلچسپ ترین کیپشن لکھنے پر انعام حاصل کیجئے۔

ذہانت ..... ؟

آدمی (تھانے دار سے) ..... جناب جنگل میں ڈاکوؤں نے میری کار روک لی مجھ سے نقدی اور زیور چھین لیا اور پھر میری کار میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔

تھانے دار ..... لیکن تمہارے پاس تو ریوالور موجود تھا۔

آدمی ..... جی ہاں تھا تو سہی لیکن وہ اسے ڈھونڈ نہ سکے میں نے اسے چھپا دیا تھا۔

دفتر سے دیر

بیوی ..... آج آپ نے دفتر میں بہت دیر کر دی؟

شوہر ..... ہاں آج چپراسی مجھے جگانا بھول گیا تھا۔

دوست کی تصویر

ایک شخص کو اپنے دوست کی یاد بُری طرح ستانے لگی۔ وہ مصور نہ تھا، لیکن سوچنے لگا کیوں نہ اپنے دوست کی تصویر بنالوں۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو وہ تصویر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آہ دوست تم کتنے بدل گئے ہو؟"

دوسرا پیکٹ

ماں ..... عرفی بیٹے! الماری میں بادام کے دو پیکٹ رکھے ہوئے تھے لیکن اب وہاں ایک ہے؟

عرفی ..... (معصومیت سے) امی جان! الماری میں اندھیرا تھا اس لئے دوسرا مجھے نظر ہی نہیں آیا۔

ہاتھ دے دو

ایک کنجوس آدمی ڈوب رہا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا۔ "ہمیں اپنا ہاتھ دو ہم تمہیں بچالیں گے۔" اس آدمی نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور وہ ڈوب گیا۔ اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے یہ واقعہ اس کی بیوی کو سنایا تو وہ کہنے لگی۔ "اس نے کبھی کسی کو کوئی چیز نہیں دی اگر تم کہتے ہمارا ہاتھ لو تو وہ فوراً ہاتھ پکڑ لیتا اور اس کی جان بچ جاتی۔"

پہلی تقریر

ایک آدمی رنگ برنگی جوتیوں کی بوری بھر کر اپنے گھر لایا بیوی نے پوچھا۔ "یہ اتنے بہت سارے جوتے آپ کہاں سے لائے ہیں۔"

آدمی بولا ..... "بیگم آج میری پہلی تقریر تھی۔"

خوش نصیبی

ایک راہ گیر سائیکل سوار کی ٹکر سے گر پڑا سائیکل سوار نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا "تم بہت خوش نصیب ہو۔"

راہ گیر غصے سے بولا ..... "ایک تو ٹکر مار کر میری پسلیاں توڑ دیں اوپر سے مذاق بھی اڑاتے ہو۔"

سائیکل سوار نے سنجیدگی سے کہا ..... "مذاق نہیں میں دراصل ٹرک ڈرائیور ہوں تم اس لئے خوش نصیب ہو کہ آج میں سائیکل پر سوار تھا۔"

کوئیز کہانی

پہلی کوشش

اسامہ بن سلیم

آپ کی ذہانت اور معلومات عامہ کے امتحان کے لئے ہم اس بار نئے انداز کا کوئیز متعارف کروا رہے ہیں۔ یہ کوئیز بہ ظاہر ایک مہماتی کہانی ہے لیکن حقیقت میں کہانی کے ساتھ ساتھ ایک انوکھا کوئیز بھی ۔ کہانی میں معلومات عامہ کی دس غلطیاں جان بوجھ کر چھوڑ دی گئی ہیں۔ اب دیکھیں کہ آپ کی قابلیت ان غلطیوں کی نشاندھی کر پاتی ہے یا نہیں ؟ صرف نشاندھی کافی نہیں، آپ کو معلومات عامہ کی غلطیوں کو درست بھی کرنا ہو گا۔

اپنے جواب ایک صاف کاغذ پر خوشخط لکھ کر آئندہ ماہ کی دس تاریخ سے قبل ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم درست جواب بھجوانے والے ساتھیوں کے نام بھی شائع کریں گے اور قرعہ اندازی کے ذریعہ تین خوش نصیب ساتھیوں کو انعام بھی دیں گے۔ آپ کے جواب کے ساتھ اس مقابلے میں شرکت کا وہ کوپن بھی آنا ضروری ہے جو اس رسالے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔ کوپن کے بغیر آپ کی شرکت ممکن نہ ہو گی۔

کوئیز کہانی پر آپ کی تنقید، اور تبصرے کا انتظار رہے گا۔

(مرتب)

حق اسکواڈ پڑھ پڑھ کر ان تینوں کا دماغ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو بین الاقوامی شہرت رکھنے والے کردار فرلاک بومز کے پائے کا جاسوس سمجھنے لگے تھے۔

ان کے بولنے چالنے، چلنے پھرنے اور دیکھنے کا انداز یکسر بدل گیا تھا۔ ہر نئے آدمی کو دیدے چڑھا کر دیکھنا ان کی عادت بن گیا تھا۔ جاسوسوں کی سی اداکاری کر کے وہ اکثر اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتے رہتے کہ وہ واقعی اب مکمل جاسوس بن چکے ہیں۔ دانش، ذیشان اور حسن آپس میں بھائی تھے مگر کوئی انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بھائی ہوں گے۔ وہ بہت اچھے دوستوں کی طرح ساتھ رہتے۔ ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ اکثر خلاؤں میں رہتے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی منصوبہ بناتے رہنا ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔ تصور ہی تصور میں وہ سینکڑوں ملک دشمنوں کو گرفتار کروا کے اپنے ملک کے لئے اعلیٰ کارنامے سرانجام دے چکے تھے۔

دانش کی عمر ۱۴ برس تھی، ذیشان دانش سے دو سال چھوٹا تھا جبکہ حسن ذیشان سے دو سال چھوٹا۔ ان کی ایک بہن بھی تھی "انعم" مگر ان تینوں بھائیوں نے انعم کو کبھی اپنے عزائم کا پتہ نہیں چلنے دیا تھا۔ انعم ابھی تھی بھی چھوٹی اس لئے ہر وقت امی سے چپکی رہتی۔

ذیشان "حق اسکواڈ" پڑھتے پڑھتے اچانک اٹھا اور تڑاخ سے کتاب کو بستر پر دے مارا۔

"ہونہہ، یہ بھی کوئی کارنامہ ہے کبھی لالو کو پکڑوا دیا، کبھی ٹھیلے والوں کو اسکول سے ہٹوا دیا..... یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ ایسا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ کارنامہ تو ہم دکھائیں گے اور دنیا دیکھے گی ہمارا کارنامہ" ذیشان نے اکڑتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

حسن نے اچھل کر جاسوسوں والا پوز بنایا اور منہ سے ٹھشوؤں ٹھشوؤں کی آوازیں نکال کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے اس نے اپنے پستول سے دشمنوں کو بھون کر رکھ دیا ہو۔ بیڈ روم میں جاسوسی فلموں والا یہ ہنگامہ جاری تھا کہ امی ہاتھوں میں چمٹا لئے چیختی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے تم لوگوں نے، زرا دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتے..... ذیشان اور حسن اگر تمہارا ہوم ورک مکمل نہیں ہوا تو ایسی درگت بنے گی کہ یاد رکھو گے....." امی ڈانٹ ڈپٹ کر چلی گئیں اور یہ تینوں بھائی کچھ دیر کے لئے اپنی کتابیں لے کر ایسے بیٹھ گئے جیسے کسی بہت ہی اہم تحقیق میں مصروف ہوں.....

تینوں بھائیوں نے ہوم ورک جلدی جلدی مکمل کرنے کی کوشش کی..... ذیشان بہ ظاہر قلم سے کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا دھیان ہوم ورک کے بجائے کہیں اور تھا۔

ذیشان بہت دنوں سے کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جس کی سرگرمیاں مشکوک ہوں اور جسے

سراغرسانی کے لئے نشانہ بنایا جاسکے۔ لکھتے لکھتے اچانک ایک نام ذیشان کے ذہن میں آیا۔ اس نے قلم کاپی پھینکی اور خوشی سے چلاتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

"یہ ملا، یہ پکڑا......" ذیشان خوشی سے چلایا

"ارے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے کیا۔ ؟" دانش نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا

"خواب نہیں حقیقت ! سراغرسانی کے لئے بندہ سمجھ میں آگیا ہے، انتہائی مشکوک، بلیک میلر، سخت گڑبڑ......"

"کون ہے ...... کون ہے وہ ؟" حسن اور ذیشان نے اشتیاق اور بے چینی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر بشیر" ذیشان نے جواب دیا۔

ڈاکٹر بشیر اس پلازہ کا سیکورٹی انچارج تھا جس میں یہ تینوں رہتے تھے۔ پلازہ کے سبھی لوگ اسے سمجھدار بہادر اور قابل احترام سمجھتے تھے اور اس کی بے حد عزت بھی کرتے تھے مگر ذیشان اسے "مشکوک اور خطرناک" قرار دے چکا تھا۔

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے" دانش نے غصے سے ذیشان کو گھورتے ہوئے کہا...... "اتنا شریف آدمی بھلا مشکوک کیسے ہو سکتا ہے......"

"ہو سکتا ہے بھائی ہو سکتا ہے تم بہت جلدی جان جاؤ گے۔" ذیشان کے انداز گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ ڈاکٹر کے متعلق کوئی ایسی بات جانتا ہے جو دوسرے نہیں جانتے۔

بس اب جو کام ہمیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر کے بیٹے سے دوستی کرلیں، اتنی پکی دوستی کہ ہم آسانی سے اس کے گھر آجاسکیں۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد ڈاکٹر کا بیٹا یوسف، دانش، ذیشان اور حسن کا دوست بن چکا تھا۔ یوسف، حسن کا کلاس فیلو تھا اس لئے حسن کو یوسف سے تعلقات بڑھانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

دانش، ذیشان اور حسن نے یوسف کو اتنی بار اپنے گھر پر کھانے اور چائے کی دعوت دی کہ جواباً یوسف کو بھی ان تینوں کو اپنے گھر پر بلانا پڑا۔ یوں کچھ ہی دنوں میں یوسف ان کا بہت اچھا دوست بن گیا اور ایک دوسرے کے گھروں میں ان کی آمد و رفت بڑھتی چلی گئی......

ڈاکٹر بشیر فوج کا ریٹائرڈ ملازم تھا، وہ آرمی میں ونگ کمانڈر کے عہدے پر رہ چکا تھا۔ ان دنوں وہ پلازہ کے قریب ہی اپنی پرائیویٹ کلینک چلا رہا تھا۔ کلینک کے اوقات کے علاوہ، وہ اپنا سارا وقت [illegible] حفاظت اور اسکی دیکھ بھال کو دیتا۔ گزشتہ دو سال کے دوران اس نے پلازہ میں چور، اچکوں لوگوں کو بڑی تعداد میں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ ڈاکٹر بشیر مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے

اور سرعام رسوا بھی کیا کرتا۔

ان ساری باتوں کے باوجود جو چیز ڈاکٹر کی حیثیت کو مشکوک بنا رہی تھی وہ یہ تھی کہ آج تک پکڑے جانے والے اکثر خطرناک مجرموں کو کبھی پولیس اسٹیشن نہیں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر خطرناک مجرموں کو اپنے گھر کے ایک کمرے میں لے جاتا اور وہاں بہت دیر تک رکھنے کے بعد چھوڑ دیا کرتا۔ ڈاکٹر بشیر کوئین ایڈورڈز کالج لاہور سے فارغ التحصیل تھا۔ وہ لاہور سے چند برس قبل ہی وہ اپنی فیملی کے ساتھ کراچی منتقل ہوا تھا۔

ذیشان نے کسی سے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر مجرموں سے پیسے لے کر انہیں چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے شک کو تقویت اس بات سے مل رہی تھی کہ کوئی مجرم کبھی پولیس اسٹیشن نہیں لے جایا گیا۔

ڈاکٹر کی اصلیت کا پتہ کیسے چلایا جائے؟ یہی ان تینوں کا Target تھا۔ اور وہ اسے جلد سے جلد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

پلازہ کی چھت پر بنی ہوئی پانی کی ٹنکی کے نیچے انہوں نے اپنا مستقل ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ جسے وہ اپنا مورچہ کہتے تھے۔ یہاں بیٹھ کر وہ پلازہ کے اطراف ہونے والے واقعات کا جائزہ لیتے، آنے جانے والے لوگوں پر نظر رکھتے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے غور و خوض کرتے۔

چھٹی کے روز ناشتہ کرنے کے بعد تینوں بھائی اپنے مورچے جا پہنچتے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو پکڑنے کے لئے مختلف نوعیت کے کام آپس میں تقسیم کر لئے۔ دانش کا کام ڈاکٹر کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا، ذیشان کی ذمہ داری پلازہ کے لوگوں سے ڈاکٹر کے متعلق ٹوہ لینا اور حسن کا کام ڈاکٹر کے گھر والوں کے ذریعہ ڈاکٹر کے گزشتہ دنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ تینوں اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد ڈاکٹر سے متعلق حسن بہت سی معلومات جمع کر چکا تھا۔ مورچے میں بیٹھ کر حسن نے بتایا

..... ڈاکٹر ۲ سال تک اردن کے دارلخلافے بغداد میں رہ چکا ہے۔

..... ڈاکٹر کی دو شادیاں ہیں اور اسکی دوسری بیوی شہر کے کسی اور حصے میں رہتی ہے۔

..... ڈاکٹر کے پاس جاپان کی بنی ہوئی ایک فاکس ویگن بھی ہے جو اس نے حال ہی میں خریدی ہے۔

..... اس مشکوک ڈاکٹر کے بزرگ مشرقی پنجاب کے شہر کیرالہ کے رہنے والے ہیں۔

..... ڈاکٹر آج تک کہیں بھی دو سال سے زیادہ عرصے تک ٹک کر کام نہیں کر سکا ہے۔ اور یہ کہ ڈاکٹر کے مالی حالات گزشتہ دو سالوں میں خاصے اچھے ہوگئے ہیں۔

ذیشان بھی پلازہ کے لوگوں سے مل کر ڈاکٹر سے متعلق بعض ایسی معلومات حاصل کر چکا تھا جس سے ان کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ ڈاکٹر پراسرار آدمی ہے۔ سردیوں کی ایک رات جب گھر کے سب لوگ ٹی وی کا مشہور پروگرام "حامد میاں کے ہاں" دیکھ رہے تھے، یکایک شور سنائی دیا۔

پکڑ لیا پکڑ لیا..... پکڑا گیا!!

یہ آوازیں سن کر دانش اور ذیشان بھی چونکے۔ انہوں نے فلیٹ کی بالکونی سے باہر جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اور اس کے کچھ دوست ایک شخص کو گھسیٹتے اور مارتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نے آج پھر ایک مجرم کو پکڑا تھا۔ اور دانش وغیرہ کو اسی موقعہ کا انتظار تھا۔ اس موقع پر انہیں کیا کرنا ہے؟، اس کی منصوبہ بندی وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ پلازہ کے احاطے میں چیخ پکار اور مجرم کی مار کٹائی کا سلسلہ جاری تھا۔ دانش اور ذیشان نے حسن کو ٹیپ ریکارڈر دے کر مہم پر روانہ کر دیا۔

مجرم کے ساتھ ڈاکٹر نے وہی سلوک کیا جو اب تک اس پلازہ میں ہوتا آیا تھا۔ ہیروئین کا خطرناک اسمگلر، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کے گھر لیجایا گیا۔ پھر ڈاکٹر نے سب کو یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا کہ میں تنہائی میں تفتیش کرنا چاہتا ہوں۔ تفتیش مکمل ہو چکی تو ڈاکٹر نے پلازہ کے بہت سے لوگوں کے سامنے CIA کے دفتر فون کیا اور مجرم کے پکڑے جانے کی خبر دی۔ سی آئی اے دراصل خفیہ پولیس کا ایک سرکاری ادارہ ہے جس کا پورا نام کرائم انٹرپول اتھارٹی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک گاڑی آئی جس سے سادہ کپڑوں میں ملبوس کچھ قد آور سے لوگ اترے اور اسمگلر کو لے کر چلے گئے۔ پلازہ کے لوگ مطمئن ہو گئے کہ مجرم پکڑا گیا۔ مگر اگلے ہی روز ڈاکٹر کے بیڈ روم میں لگا ہوا ٹیپ ریکارڈر، اسمگلر اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی گفتگو تین کمسن جاسوسوں کے ابو کو سنوا رہا تھا۔

ٹیپ شدہ آوازوں کو سن کر انجم صاحب چونک گئے۔ ڈاکٹر نے اسمگلر سے سودا طے کر لیا تھا۔ اسمگلر کے پاس پاکستانی کرنسی نہیں تھی البتہ اس نے ایک لاکھ روپے مالیت کے برابر افغانی کرنسی "درہم" دینے کے لئے کہا۔ ڈاکٹر نے یہ سودا منظور کر لیا اور اسمگلر سے وعدہ کیا کہ تھوڑی دیر میں میرے آدمی "سی آئی اے" کے روپ میں آئیں گے اور تمہیں بہ ظاہر گرفتار کر کے لے جائیں گے لیکن آگے جا کر چھوڑ دیں گے۔

یہ پوری گفتگو سن کر جیسے بھونچال سا آگیا ہو۔ دانش ذیشان اور حسن کے ابو ٹیپ ریکارڈر لے کر جب CIA کے دفتر پہنچے اور انسپکٹر صاحب کو پورا واقعہ بتایا، تو انسپکٹر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اس نے بتایا

کہ یہ ڈاکٹر تو ہمیں بھی مطلوب ہے اور سی آئی اے کے حلقوں میں یہ "ڈاکٹر فراڈ" کے نام سے مشہور ہے۔

اگلی صبح ہونے سے قبل "ڈاکٹر بشیر" گرفتار ہو چکا تھا۔ بعد میں یہ بھی پتہ چلا کہ پلازہ میں ہونے والی اکثر وارداتیں ڈاکٹر خود کروایا کرتا تھا۔

ڈاکٹر کی گرفتاری اور بچوں کے کارنامے نے پلازہ کے سب لوگوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا..... ہر شخص پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر پوچھتا کہ " آج تک یہ سب کچھ ہوتا رہا اور ہمیں پتہ تک نہ چلا۔ " تین کمسن بھائیوں کے کارنامے کی خبر پورے پلازہ میں پھیل چکی تھی مگر دانش، حسن اور ذیشان یہ بات جانتے تھے کہ ان کے نام کی تشہیر ہونا اچھی بات نہیں۔ وہ آئن فلیمنگ کے جاسوسی ناول سیمنر بونڈ 009 میں یہ بات پڑھ چکے تھے کہ "سراغرسانوں کو ہمیشہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا چاہئے" آج اپنی پہلی کوشش پر وہ بے حد خوش تھے اتنے خوش کہ انہیں رات بھر نیند نہ آئی۔

کیا مسلمان کولمبس سے پہلے امریکہ پہنچ گئے تھے؟

سید سلیمان ندوی صاحب کی تحقیق کے مطابق مسلمان کولمبس سے پہلے امریکہ پہنچ گئے تھے یہ سن کر لوگوں کا سوال تھا کہ اگر امریکہ میں کولمبس سے پہلے عربوں کی آمد و رفت تھی تو ان کے نشانات کیوں نہیں ملتے۔ مگر خدا کی قدرت دیکھئے انہی دنوں مصر کے اخباروں نے یہ خبر شائع کی جو الفتح مصر مورخہ ۳۰ جمادی الاول ۱۳۵۴ص ۲۴۶ میں چھپی کہ لبنان کے عیسائی فاضل الطون یوسف بشارہ جنہوں نے میکسیکو میں سکونت اختیار کر لی ہے اپنی زمین میں جو ریوکرسی میں ہے کھدائی کرا رہے تھے کہ ان کو دو معدنی ٹکڑے ملے جو تحقیق کے مطابق عربی سکے ثابت ہوئے۔

سید صاحب کے اقتباس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان بارہویں صدی عیسوی ہی میں بحر اوقیانوس کو عبور کر کے امریکہ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے وہاں رہائش بھی اختیار کر لی اور جو سکہ وہ لے گئے تھے وہی وہاں رائج ہو گیا۔

سید عبدالمنان کرمانی راولپنڈی

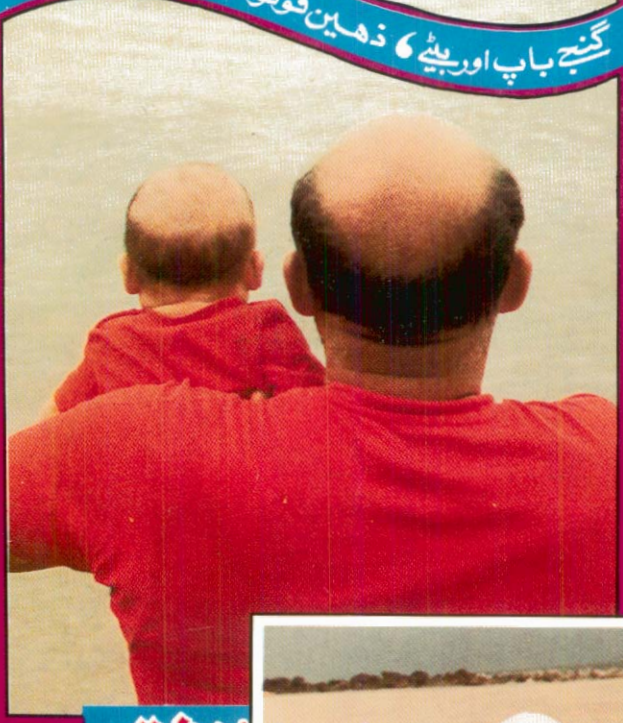

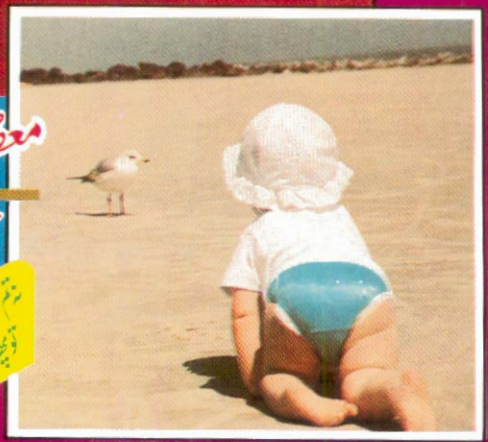

یوں بھی ہوتا ہے — "بال بال بچنا"
گنجے باپ اور بیٹے، ذہین فوٹوگرافر کی زد میں
معصوم مخلوق
حسین لمحہ
نہ تم کو خوف ہے مجھ سے نہ مجھ کو ہی کوئی ڈر ہے
تو پھر اے بے زباں طائر چلو ہم دوستی کر لیں

لال گلاب

ڈاکٹر عارف ایوبی لکھنؤ (بھارت)

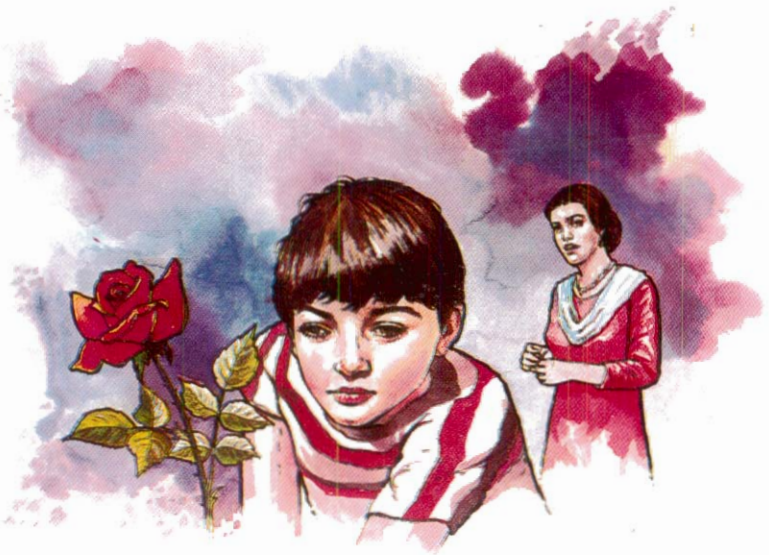

عارف ایوبی (لکھنؤ)

بھابھی جان کو ایک ایک لمحہ دو بھر ہو رہا تھا، ”نہ جانے کیا بات ہے کہ ببو ابھی تک نہیں آیا روز تو اپنے وقت پر آجایا کرتا تھا۔ اسکول میں چھٹی ہوئے بھی تو دو تین گھنٹے بیت چکے ہوں گے۔“ گھبراہٹ کی وجہ سے ان کا گلا سوکھ گیا تھا۔

انہوں نے فریج سے پانی نکال کر ایک گلاس پیا۔ لیکن انہیں اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ پانی پیا یا نہیں۔ گھبراہٹ کی وجہ سے تھوڑا پانی چھلک کر دوپٹے پر گرنے سے، دوپٹہ تھوڑا بھیگ گیا تھا، اسی بھیگے ہوئے دوپٹے سے منھ پوچھتے ہوئے، انہوں نے رحیمو کو آواز دی، لیکن ..... ؟ رحیمو ..... ؟ ہو تو آئے۔ ”اس کو بھی اسی وقت بازار جانا تھا۔ کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ببو کو ڈھونڈنے ؟ نوکر وہ بھی غائب، یہ سوچ کر بھابھی جان اداس ہو گئیں۔

اسی وقت گھر کا دروازہ ایک مخصوص آواز کے ساتھ کھلا اسی آواز سے انہیں محسوس ہوا کہ کوئی اور نہیں، بلکہ یہ ببّو ہی ہو گا۔ کیوں کہ وہی دروازے کو کچھ اس طرح کھولتا ہے کہ دروازے کی زنجیر چھنک اٹھتی ہے۔

آنے والے کو دیکھنے کے لئے جب وہ آدھے صحن تک پہنچیں، تو دیکھا کہ ببو بڑی خوشی کے ساتھ داہنے ہاتھ میں ایک پودا لئے اور بائیں ہاتھ سے، کبھی نیکر تو کبھی بھیگا ہوا اسکول بیگ سنبھالتا چلا آرہا ہے۔ اس کا حلیہ تو دیکھنے والا تھا۔ بش شرٹ اور نیکر تو گیلی مٹی سے سنے ہوئے، اور جوتوں سے گھٹنوں تک کیچڑ میں تربتر۔ یہ دیکھ کر بھابھی جان ایک دم پریشان آخر ماجرا کیا ہے۔ لیکن ببّو کے مسکرانے کا انداز کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی وہ کوئی قلعہ فتح کر کے اس کے اوپر جھنڈا لہرا کر آیا ہو۔

"ممّی..... ! ممّی..... !! دیکھئے کتنا خوب صورت لال گلاب کا پودا لایا ہوں۔ اسکول سے سیدھا یاسمین کے گھر چلا گیا تھا۔ اس کے پیڑ میں ایک دم کٹورے کے برابر اتنا بڑا پھول کھلتا ہے۔" بائیں ہاتھ کے اشارے سے پھول کا قطر بناتے ہوئے کہا۔ "اور ممّی ..... ! دیکھئے تو اس کی پتیاں کتنی نازک ہیں۔"

ابھی تک بھابھی جان جس دکھ اور گھبراہٹ کے ملے جلے اثرات سے پریشان ہو رہی تھیں، وہی دکھ اور گھبراہٹ اب غصہ میں تبدیل ہو گیا اور تقریباً چیختے ہوئے بولیں، "ارے کم از کم کہہ کر تو گیا ہوتا۔ تیری وجہ سے میں یہاں پریشان ہو رہی ہوں اور آپ گلاب کے پودوں کے لئے دوستوں کے گھر کے چکر لگا رہے ہیں۔"

لیکن ببو نے جیسے سنا ہی نہیں، وہ اپنی چھوٹی سی کیاری کے چاروں طرف نظریں گھماتا ہوا سوچ رہا تھا، اس پودے کو کہاں لگایا جائے؟ ادھر اس کیاری میں جہاں رات کی رانی چھائی ہوئی ہے؟ نہیں، نہیں، وہاں تو رات کی رانی کی مہک میں اس کی خوشبو دب جائے گی۔ اس گلاب کے لئے الگ جگہ ہونا چاہئے، سب سے الگ۔ پھر اسے کہاں لگایا جائے؟ ادھر اس دروازے کے قریب؟ لیکن وہاں پر بھی کسی کا پیر وير پڑ جائے تو سب برباد ہو جائے گا۔ آخر بڑے غور و فکر کے بعد لیموں کے پیڑ کے قریب ایک جگہ چن لی۔ جب جگہ کا انتخاب ہو گیا، تب پھر اپنی کھسکتی ہوئی نیکر کو سنبھالتے ہوئے اندر کھرپی لینے دوڑا، "ارے کھانا تو کھالے، ویسے ہی اتنی دیر سے آیا ہے اور اب چلا ہے مٹّی کھودنے۔" بھابھی جان نے کہا، لیکن اس وقت لال گلاب کے سامنے ماں کی آواز کچھ تھی ہی نہیں۔ کھانا تو دور کی بات ہے، اس وقت کوئی ببو کو چاکلیٹ کی لالچ بھی دیتا، تو اس کی طرف نہ دیکھتا۔ حالانکہ چاکلیٹ ببّو کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

بڑی محنت سے گڑھا کھودا، اس میں سے کچھ کنکر پتھر نکالے پھر کیاری کے کونے میں پڑی ہوئی

کھاد میں سے تھوڑی لے کر مٹی میں ملائی اور بھر بھرا کر کے تھوڑی گڑھے میں بھر دی اس کے بعد پودے کو رکھ کر باقی مٹی بھی گڑھے میں بھر دی اور چاروں طرف مینڈ بنا دی پھر اس میں ایک لوٹا پانی ڈال دیا لیکن ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ پانی مٹی میں اس طرح جذب ہو گیا جیسے مٹی جنم جنم کی پیاسی رہی ہو۔ ببّو پھر پانی لینے کے لئے بھاگا۔ اس بار کچھ پانی جذب ہوا، اور کچھ اوپر رہ گیا اور اس میں مٹمیلا جھاگ بن گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، اب اس کی پیاس بجھی۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "اب یہ اگ آئے گا۔ روزانہ اس کی دیکھ بھال کروں گا۔ پھر ایک دن ایکدم لال اور بڑا سا پھول کھلے گا۔ اس میں کتنی خوشبو ہوگی؟ اف کتنی؟" یہ سوچ کر وہ مستقبل کی ساری خوشبو ابھی سے محسوس کرنے لگا تھا، اور اس نے کچھ اس انداز سے اپنی ناک اوپر چڑھائی اور آنکھیں بند کیں، جیسے واقعی لال گلاب سونگھ رہا ہو۔ بھابھی جان نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو قہقہہ مار کر ہنس پڑیں قہقہے کی آواز پر ببّو نے مڑ کر دیکھا، تو پہلے تو اپنی حالت پر شرما گیا لیکن پھر فوراً اپنی جھینپ مٹاتا ہوا بولا، "ممی ..... اس میں چاچو کا جو سفید والا گلاب ہے نا، اس کا ٹھیک دوگنا بڑا پھول کھلے گا تم دیکھ لینا ممی۔" اس نے ایک بار پھر گلاب کے پودے کی طرف دیکھا، اور لوٹا لے کر اندر کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

دوبارہ پانی ڈالنے کے بعد پھر وہیں پر کھڑے کھڑے اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔ "جب پودا میری کمر تک بڑا ہو جائے گا، تب کتنا اچھا لگے گا۔ اس کی چھٹائی کیا کروں گا، تو بہت گھنا، ہرا بھرا اور خوبصورت دکھائی دے گا۔ اور جب اس کی ہری ہری پتّیوں میں سُرخ کلی نکلے گی اور کھلے گی تب بن جائے گی... ایک بڑا مہکتا ہوا لال گلاب کا پھول۔" اور پھر گلاب کے پودے کو دیکھنے لگا۔

آخر ماں کے بار بار کہنے پر ببّو سونے کے لئے چلا گیا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کیاری کے ٹھیک سامنے کھلتی تھی۔ آدھی رات کے بعد جب اسے محسوس ہوا کہ اس کا کمرا مہک رہا ہے، اور بہت مہک رہا ہے، صرف لال گلاب کے پھول سے، تو وہ اٹھا، اور بستر پر بیٹھے بیٹھے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو سامنے اندھیرے میں نیم کے پاس کچھ ٹیڑھی، دھندلی اور چھوٹی سی شکل دکھائی دی کچھ وقفے کے بعد جب اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو اس نے دیکھا، یہ وہی اس کا لگایا ہوا گلاب کا پودا ہے۔ حالانکہ جب اس نے گلاب کا پودا لگایا تھا تب اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی جھلک اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے مل جائے گی، اس لئے غیر متوقع منظر پر مسکرا اٹھا۔

صبح ہوتے ہی وہ سب سے پہلے گلاب کے پودے کے پاس پہنچا، اب اس کی پتیاں مرجھا گئی تھیں۔ "ارے اسے کیا ہو رہا ہے؟" وہ اداس ہو کر اندر بھاگا، اور ماں کو پکڑ لایا۔ "ممی دیکھئے پودے کو کیا

ہو گیا؟ یہ کملایا جا رہا ہے۔"

ماں نے پودے کو دیکھا، اور بولیں "ٹھیک تو ہے پہلے اس کی ساری پتیاں جھڑ جائیں گی پھر نئی نکلیں گی۔ ایسے کیسے بڑا ہو جائے گا۔"

"ممی کیا ہر پودے کی پتیاں پہلے جھڑتی ہیں؟"

"ہاں پہلے ہر پودے کی پتیاں جھڑتی ہیں، تب نئی نکلتی ہیں۔"

"آپ کو اچھی طرح معلوم ہے ممی؟"

"ہاں! ہاں! بابا"۔ اور بھابھی جان لیموں کے پیڑ میں لیموں تلاش کرنے لگیں۔

ببو نے چین کا سانس لیا، "چلو میرا پودا خراب نہیں ہو رہا ہے، وہ تو ہر پودا پہلے مرجھا جاتا ہے۔"

دھیرے دھیرے پودے کی سبھی پتیاں پیلی ہوتی گئیں، اور پھر گر گئیں۔ ببو اس میں بلا ناغہ پانی ڈالتا رہا۔

ایک دن جب وہ اسکول سے گھر واپس آیا تو دیکھا اس میں ایک نئی شاخ نکل آئی ہے۔ اور اس میں نرم نرم مخمل جیسی پتیاں نکل آئی ہیں۔ تب اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ "آخر میرا پودا لگ گیا!"

"ممّی.....!! ممّی.....!! دیکھئے میرے پودے میں نئی شاخ!" اور بے تحاشا چیختا ہوا اندر کی طرف بھاگا۔

ببو گھنٹوں اس پودے کو دیکھتا رہتا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی پتیاں نکلتی ہیں؟ ان میں کتنی چمک ہوتی ہے؟ کتنی باریک ہوتی ہیں؟ اور یہ سب چیزیں اسے متحیر کر دیتیں، اور وہ پھر پریشان ہو جاتا۔ آخر کب نکلے گا اس میں پھول؟

آخر ایک دن ہری ہری پتیوں میں ایک کلی نمودار ہوئی، جو کہ پتیوں سے کچھ چھپی ہونے کی وجہ سے پوری طرح سے سرخ نہیں تھی۔ ببو نے دیکھا تو اچھل پڑا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے کلی کو سہلانے کے لئے دھیرے سے ہاتھ بڑھایا، لیکن فوراً خیال آیا کہ چاچو نے کہا تھا، کلی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے ورنہ سوکھ جاتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنا ہاتھ اتنی تیزی سے کھینچا، جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

دھیرے دھیرے وہ کلی بڑی ہوتی گئی۔ ایک..... دو..... تین..... چار..... اور پانچویں دن وہ کلی نہ تھی بلکہ گلاب کا ایک لال پھول تھی، ٹھیک چاچو کے سفید گلاب کا دوگنا۔ ایک خوبصورت مہکتا ہوا لال

گلاب کا پھول۔ ببو نے اسے بڑی محبت سے سہلایا، اور اسے قریب سے دیکھا تو اس میں بہت سی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ اس نے شاخ کو تھوڑا سا جھکایا، اور اسے ناک سے قریب کر کے سونگھا..... "اف..... فوہ..... ! کتنا خوشبودار ہے؟ میں نے آج تک اتنا خوشبودار پھول نہیں سونگھا۔ آج تو پورا گھر مہک رہا ہے۔ آج یاسمین کو گھر لاکر دکھاؤں گا اور مسکراتا ہوا اسکول چلا گیا۔ دو تین دن کے بعد پودے میں ایک اور کلی نکلی، اسے بھی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

گھڑی نے چار بجائے تو ببو جلدی جلدی اسکول سے گھر آیا، شاید اتنی دیر میں دوسری کلی بھی کھل گئی ہو۔ اس نے اپنے مخصوص انداز سے دروازہ کھولا..... زنجیر چھنکی..... لیکن یہ کیا؟ اس کا پودا وہاں پر نہیں تھا۔ شاید کسی نے اکھاڑ لیا تھا، کھدی ہوئی مٹی ڈھیر کی جیسی نظر آرہی تھی۔ اور پودے کی جگہ پر گڑھا نظر آرہا تھا۔ ببو نے آنکھیں پھاڑ کر اچھی طرح دیکھا، کہیں غلط جگہ پر تو نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن نہیں وہ تو بالکل ٹھیک جگہ پر دیکھ رہا تھا۔ واقعی وہاں پر گلاب کا پودا نہیں تھا۔

"یہ کیا ہوا..... ؟ ممّی..... ! ممّی..... !!" وہ روتا ہوا ماں کے پاس بھاگا۔

ممی میرا گلاب کا پودا..... ! اس نے لمبی ہچکی لی۔

"بیٹے روتے نہیں۔ چپ ہوجاؤ۔" بھابھی جان نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "بیٹے آج ہماری مکان مالکن آئی تھیں، جب انہوں نے پودا دیکھا تو انہیں پسند آیا کہنے لگیں یہ مجھے دے دیجئے۔ میں نے کئی بار منع بھی کیا۔ لیکن انہوں نے کافی ضد کی تو مجبور ہو کر دینا ہی پڑا۔

"کیا کہہ رہی ہیں ممی؟ آپ نے انہیں پودا دیا؟" وہ چیخ اٹھا۔

"بیٹے روتے نہیں، تمہارے پاپا سے کہہ کر اور پودے منگوادیں گے۔ اس سے بھی بڑے پھول والے۔"

"نہیں، مجھے تو وہی چاہئے۔ وہی۔" وہ روتا سسکتا اور پیر پٹختا ہوا کیاری کی طرف چلا گیا، اور اس تازہ بنے ہوئے گڑھے کو دیکھنے لگا، جس کی وجہ سے اس کی کیاری سونی ہوگئی تھی۔ بھابھی جان نے کئی بار بلایا بھی، لیکن وہ گیا نہیں اور نہ ہی اس نے کھانا کھایا۔ "آخر یہ کون ہوتی ہیں ہمارا پودا دینے والی، اور مکان مالکن وہ بھی تو پوری چڑیل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم کرائے دار ہیں، تو مکان کا کرایہ بھی تو دیتے ہیں۔ پودا کیوں دیں، بڑی آئیں پودا اکھڑوانے والی۔"

اس نے فیصلہ کیا، جیسے بھی ہو، وہ اپنا پودا واپس لائے گا اسی لئے وہ روزانہ مکان مالکن کے گھر کا چکر لگا رہا تھا جو کہ دو گھروں کے بعد میں رہتی تھیں، لیکن بوڑھی مالکن ہر وقت اپنے برآمدے میں بیٹھی رہتی تھی۔ جیسے وہ کبھی ہٹتی ہی نہ ہو اس کا خیال ہوا کہ رات میں ضرور جایا جاسکتا ہے لیکن پاپا؟ وہ تو

رات میں گھر سے باہر نکلنے نہیں دیں گے۔

کچھ دنوں بعد بو نے دیکھا مکان مالکن کے گھر میں گلاب کا پودا ایک دم سوکھ گیا ہے۔ "لو اور لگاؤ گلاب کا پودا۔ خوب پھول کھلیں گے۔ وہ خشک پتیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا جن مرجھائی ہوئی پتیوں کو دیکھ کر وہ رو اٹھا تھا، آج انہیں مرجھائی ہوئی پتیوں کو دیکھ کر وہ خوش ہو رہا تھا۔

لیکن یہ کیا؟ کچھ ہی دن بعد پودا پھر سرسبز ہو گیا۔ اس میں پتیاں نکل آئی تھیں اور ایک کلی بھی۔ بو سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہتا۔ پھر اس نے دیکھا ایک کلی..... وہ پھول ہو گئی ایک بڑا سا سرخ گلاب کا پھول! جس کی خوشبو سڑک تک آ رہی تھی وہ سارا دن پودا اکھاڑنے کی ترکیب سوچتا رہا آخر اسی رات پاپا کی نظر بچا کر سڑک کی طرف بھاگا، اور مالکن کے گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اس نے چاروں طرف دیکھا، کہیں کوئی اور نہیں تھا۔ صرف بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ جو اسے بے چین کر رہی تھی اس نے مہندی کی باڑھ میں نیچے کی طرف سے ایک جگہ دیکھی جس سے وہ کچھ سمٹ کر بمشکل اندر داخل ہو سکتا تھا اور وہ جلدی سے اندر گھس گیا۔ دوسرے لمحے وہ اپنے پودے کے قریب تھا لیکن شاید مالکن جاگ رہی تھی۔ اس نے مہندی کی جھاڑی میں بو کے گھسنے کی کھڑکھڑاہٹ سن لی، "کون ہے؟" کی ایک تیز آواز آئی، اور ساتھ ہی قریب ہوتے ہوئے قدموں کی چاپ بھی۔

بو نے اپنا پورا زور لگا دیا لیکن پودا زمین کو کھود کر بویا جا چکا تھا اس کے پوری پوری طاقت لگا دینے کے باوجود اس سے اکھڑتا نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ آخری بار اس نے اپنی پوری طاقت لگا کر پودے کو کھینچا، لیکن صرف پھول والی شاخ ایک "کٹ" کی آواز کے ساتھ ٹوٹ سکی وہ اسی شاخ کو لے کر تیزی سے بھاگا۔ کیوں کہ اب مالکن برآمدے میں آ گئی تھی۔ اور اندھیرے میں بڑبڑا رہی تھی۔

وہ اسی بے جان شاخ کو لے کر اپنے صحن میں پہنچا، اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو، وہ شاخ اور اس پر کھلا ہوا لال گلاب کا پھول مہک رہا تھا۔ وہ روتا جا رہا تھا، اس کے آنسو رخساروں کو بھگوتے ہوئے بش شرٹ پر گر رہے تھے اور وہ مٹی بھری پتیوں اور پھول کو بے تحاشہ چومے جا رہا تھا!

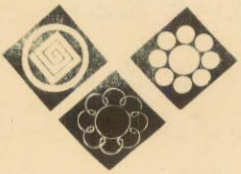

مِل جُل کے ساتھ رہنا

عبدالقادر

رہتے تھے اِک گلی میں دو پھول جیسے بچّے
باطن تھا صاف اُن کا، تھے قول کے وہ سچّے

اک روز گھر کے آگے ان کی ہوئی لڑائی
اس نے جو مُنہ چڑایا، اُس نے چپت لگائی

کانوں کو اِس نے کھینچا، اُس نے زبان دکھائی
اُنگلی مروڑی اِس نے، دھپ اُس نے اک جمائی

ماؤں نے کھڑکیوں سے دیکھا تو تن کے آئیں
اس دوسرے کے آگے تلوار بن کے آئیں

کی پہلے بدکلامی، پھر چھڑ گئی لڑائی
آپس میں چپلوں سے کرنے لگیں پٹائی

دانتوں سے کان کاٹے، گردن مروڑ ڈالی
ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں، ہر ایک توڑ ڈالی

پھر لمبے ناخنوں سے چہروں کو نوچ ڈالا
انجام کیسا ہوگا، کچھ بھی نہ دیکھا بھالا

پہلی نے دوسری کی جب موڑ دی کلائی
تب دوسری نے اس کی بیلن سے کی دُھنائی

کپڑوں کو پھاڑتی تھیں، بالوں کو نوچتی تھیں.
بازو مروڑتی تھیں، رہ رہ کے کوستی تھیں

باپوں نے جب یہ دیکھا، طوفان بن کے آئے
غیظ و غضب میں دونوں حیوان بن کے آئے

اِک دوسرے پہ جھپٹے، کی خوب ہاتھا پائی
لاتیں رسید کرکے جوتوں سے کی پٹائی

گھونسے لگائے کس کر، ڈنڈے چلائے جم کر
ضربیں لگا رہے تھے طاقت سے وہ بدن پر

تھے دونوں سخت زخمی، پھر بھی نہ ہار مانی
جب ہانپنے لگے تو کی خوب بد زبانی

ہمسائے دوڑے آئے، روکی گئی لڑائی
سمجھا بجھا کے ان میں کر دی صلح صفائی

"بچے کہاں ہیں دونوں" آواز ایک آئی
"غائب کدھر ہوئے ہیں، صورت کہاں چھپائی"

سب ڈھونڈنے کو نکلے، کچھ دُور اُن کو پایا
خوش گپوں میں گم تھے، مسرور ان کو پایا

بیٹھے مزے سے دونوں وہ سیب کھا رہے تھے
دل میں نہ تھی کدورت، وہ مسکرا رہے تھے

بچّے سکھا رہے تھے جینے کا یہ قرینہ
مِل جُل کے ساتھ رہنا، دل میں رہے نہ کینہ

۱۹۹۲ء کے آغاز پر
آنکھ مچولی کی
اچھوتی پیشکش

بچّوں کا عالمی ادب نمبر

دُنیائے اَدب کی لاجواب تخلیقات کا بے مثل انتخاب
پڑھنے، لکھنے اور سوچنے والوں کے لیے
نُدرتِ خیال کا خزانہ
بچّوں کے ادب پر باکمال دستاویز

ایک ایسا یادگار رسالہ جس کی تحریروں کو آپ برسوں تک بُھلا نہ سکیں گے

آنکھ مچولی کا "عالمی ادب نمبر"

جنوری ۱۹۹۲ء میں شائع ہو رہا ہے

آپ بھی قلم اُٹھائیے اور دُنیا کی کسی بھی زبان کی خوبصورت کہانی کو اُردو کا حسین دوشالہ پہنا کر ہمیں روانہ کر دیجئے:

ہر قابلِ اشاعت تحریر پر معاوضہ
ادب کے گمنام گوشوں سے خوبصورت کہانی تلاش کرنے پر معاوضہ دوگنا

ہم آپ کی کاوشوں کے منتظر ہیں

(ادارہ آنکھ مچولی)

- مہماتی کہانیاں
- خوفناک واقعات
- حیران کُن داستانیں
- ناقابلِ یقین قصّے
- پُر تاثر حکایتیں
- پُر کیف نظمیں

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی
سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے
رہیں گے۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھیے۔
- دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح -/۳۰۰ روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

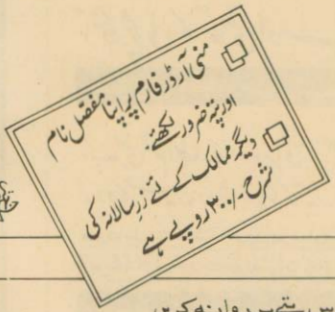

ماہ نامہ آنکھ مچولی ۔ ڈی-۱۱۲، سائیٹ کراچی

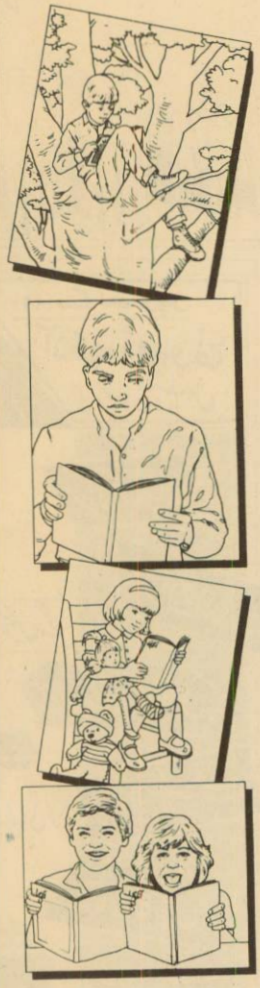

عظیم قائد

فاروق عادل

انہوں نے بچپن ہی سے ایک اصول بنا لیا تھا کہ وہ نہ صرف سامنے دیکھیں گے بلکہ اپنا سر بھی بلند رکھیں گے اور ساری زندگی انہوں نے یہی کیا۔ وہ کبھی مشکلات کے سامنے نہیں جھکے بلکہ ہمیشہ مشکلات کا چیلنج قبول کر کے ان پر قابو پانے کی جدوجہد کی۔ اپنی عظیم بہن کے بقول ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ صنوبر کے ایک ایسے اونچے درخت کی طرح بنیں، جسے طوفان چھو تو سکیں، جھکا نہ سکیں، اور پھر حقیقت میں انہوں نے اپنی زندگی طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزار دی اور ہمیشہ فتح مند رہے۔ ہم انہیں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام سے جانتے ہیں۔ انہیں بچپن میں صرف محمد علی کہا جاتا تھا۔

محمد علی جو بچپن میں پڑھنے کے کم اور کھیل کود کے زیادہ شوقین تھے، اپنی تعلیم کے بارے میں انہوں نے اپنے والدین کو بہت پریشان کیا۔ کئی مرتبہ اسکول بدلے۔ ایک مرتبہ تعلیم ہی کی خاطر اپنی

پھوپھی کے ساتھ بمبئی کا بھی سفر کیا مگر ان نے والدین تعلیم کے بارے میں ان سے زیادہ مطمئن نہ ہو سکے۔ چنانچہ بچپن ہی میں انہوں نے ضد کر کے اپنے والد محترم جناح پونجا کے ساتھ ان کے دفتر جانا شروع کر دیا مگر دو ہی ماہ کے بعد وہ اس کام سے بھی اکتا گئے اور ایک روز اپنے والد کو یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ "ابا جان! مجھے دفتر میں کام کرنا پسند نہیں ہے۔" "تو پھر تم کیا کرو گے محمد علی؟" ان کے والد نے پوچھا "میں واپس اسکول جانا چاہتا ہوں۔" بیٹے نے جواب دیا۔ اس موقع پر ان کے والد نے انہیں جو نصیحت کی، وہ ان کی زندگی کا انتہائی اہم سنگِ میل ثابت ہوئی۔ ان کے والد نے کہا،

"دیکھو بیٹا! زندگی کو سمجھنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بزرگوں کی دانش اور تجربے پر بھروسہ کریں، ان کی نصیحت قبول کریں اور ان کے مشورے کے عین مطابق عمل کریں۔"

"اور دوسرا راستہ کون سا ہے۔ ابا جان!" نو عمر محمد علی نے والد سے دریافت کیا۔

"دوسرا راستہ یہ ہے کہ آپ خود اپنے راستے پر چلیں، غلطیاں کر کے ان سے سبق سیکھیں اور زندگی کی شدید اور تکلیف دہ ٹھوکروں اور مشکلات سے زندگی کو سیکھیں اور سمجھیں۔"

یہ نصیحت محمد علی نے اپنے پلّے سے باندھ لی اور پھر اس کے بعد انہوں نے ہمیشہ قابلِ فخر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس نصیحت کے بعد جب وہ اسکول میں دوبارہ داخل ہوئے تو بالکل بدلے ہوئے تھے۔ اب نہ وہ پہلے کی طرح تعلیم سے لاتعلق اور غیر متوجہ تھے اور نہ اپنے ہم جماعتوں سے تعلیم میں کسی طرح پیچھے تھے۔ انہوں نے اپنے راستے پر چل کے، اور چند ٹھوکریں کھا کر زندگی کو سیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ یہ فروری ۱۸۹۱ء کا زمانہ تھا۔ اور وہ انٹرنس میں تھے۔ انٹرنس اس زمانے میں میٹرک کے برابر تھا، اور اس کے لئے ۷ جماعتیں پاس کرنا ہوتی تھیں۔ ان جماعتوں میں انگریزی کی تعلیم بھی شامل تھی، اب ان کی عمر پندرہ برس تھی، اور ان کے والد انہیں اپنے ایک انگریز دوست کے مشورے سے کاروباری نظم و نسق چلانے کی عملی تربیت دلوانے کے لئے لندن بھجوانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

لندن میں انہوں نے سحر خیزی اور ناشتہ کے ساتھ ساتھ اخبار کے مطالعہ کی عادت پختہ کر لی۔ ناشتہ ختم کرنے کے ساتھ ہی وہ اخبار کی تمام خبروں اور دیگر مواد کا مطالعہ کر چکے ہوتے تھے۔

ان دنوں وہ لندن کی گراہمز اینڈ کمپنی میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے سوچا "یہاں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد میں زیادہ سے زیادہ اپنے والد کا کاروبار سنبھال سکوں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے کاروبار سنبھالنے کے بعد اس منافع میں کچھ زیادہ اضافہ ہو جائے جو اس وقت میرے والد حاصل کر رہے ہیں، لیکن یہ تو زندگی کا بور اور محدود مستقبل ہے، کیا مجھے اسی پر اکتفا کر لینا چاہئے؟" انہوں نے خود سے سوال کیا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اپنے سینئر دوستوں سے اس موضوع پر کئی مرتبہ

گفتگو کی۔ ان رہنماؤں کے حالات زندگی پڑھے جو قوموں کی قیادت کر کے انہیں نئی رفعتیں عطا کرتے رہے ہیں۔ اس مطالعے نے ان پر منکشف کیا کہ بیرسٹر بننا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے بیرسٹر بننے کا فیصلہ کر لیا، اخبار کا مطالعہ رنگ لا چکا تھا۔

اب انہیں اس ادارے کی تلاش ہوئی، جہاں وہ قانون کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ ان کی نظر انتخاب اس ادارے پر پڑی جس کے صدر دروازے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دنیا کے سب سے بڑے قانون داں کی حیثیت سے کندہ تھا۔ اس ادارے کا نام لنکنز اِن تھا۔ اگلے دو سال تک وہ اس ادارے میں زیر تعلیم رہے اور اس طرح وہ اٹھارہ برس کی عمر میں بیرسٹر کہلانے والے کم عمر ترین طالب علم تھے۔ انہوں نے یہ امتحان مقررہ مدت سے قبل پاس کر لیا۔ لیکن چونکہ لنکنز اِن کا قانون تھا کہ مقررہ مدت ختم کئے بغیر ڈگری جاری نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے انہیں کچھ مدت مزید اس ادارے میں قیام کرنا پڑا۔

اس ادارے میں داخلہ حاصل کرنے کے بعد وہ محمد علی جو کراچی کے علاقہ کھارادر میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ مٹی میں گولیاں بھی کھیل لیا کرتے تھے، کتابوں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے برٹش میوزیم لائبریری میں جاکر مطالعہ کرنا اپنا معمول بنا لیا۔

ان کی زندگی کا ایک اور تجربہ دادا بھائی نوروجی کے الیکشن میں حصہ لینا تھا۔ جو اگرچہ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے پارسی تھے مگر برطانیہ کے ایک حلقہ انتخاب سے الیکشن میں حصہ لے رہے تھے۔ دادا بھائی نوروجی کے حریف سالسبری نے اپنی ایک تقریر میں انہیں "کالا آدمی" کہہ کر ان کا مضحکہ اڑایا، اور انگریز ووٹروں سے کہا کہ "انہیں ووٹ نہ دیا جائے۔" "یہ سن کر میں غصے سے کھول اٹھا۔" محمد علی نے بعد میں اپنی بہن فاطمہ جناح کو بتایا۔ "اور مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے "سیاسی آقاؤں" کی ذہنیت کیسی ہے اور یہ کہ ان سے انصاف کی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی۔" محمد علی بتاتے ہیں کہ میں اسی روز سے رنگ و نسل کے امتیاز کے خلاف ہو گیا۔

اسی زمانے میں انہوں نے ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ شکسپیئر کے ڈرامے انہیں خاص طور پر پسند تھے۔ انہیں تھیٹر دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ مگر وہ اس کام پر پیسے خرچ کرنے کی بجائے رقم بچا کر کتابیں خرید لیا کرتے تھے۔ شکسپیئر کے ڈراموں کا مطالعہ بعد میں بھی جاری رہا۔ محترمہ فاطمہ جناح بتاتی ہیں کہ کھانے کی میز پر وہ خوشگوار موڈ میں مجھے شکسپیئر کے ڈراموں کے اپنی پسند کے حصے سنایا کرتے تھے، ان کی آواز کا زیر و بم ایسا ہوتا تھا کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

فضول خرچی کی عادت بالکل نہیں تھی، لندن میں انہوں نے چار سال قیام کیا۔ اس عرصہ میں انہوں نے صرف آٹھ سو ڈالر کی رقم خرچ کی، ان کے سادہ انداز زندگی کا اندازہ اس سے بآسانی لگایا

جاسکتا ہے۔

لندن سے واپسی کے بعد انہوں نے بمبئی میں قانون کی پریکٹس کرنے کا پروگرام بنایا۔ مگر تین سال تک انہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی، مگر اس مشکل زمانے میں بھی مایوسی ان پر قبضہ نہ جما سکی۔ ان کی وضع داری برقرار رہی۔ اس عرصے میں بھی انہوں نے خوب مطالعہ کیا۔

اسی زمانے میں انہیں ریزیڈنٹ مجسٹریٹ کی عارضی آسامی پر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس عہدے کی مدت ختم ہوئی تو انہیں پیشکش کی گئی کہ وہ مستقل طور پر اسی حیثیت میں کام کر سکتے ہیں۔ مگر انہوں نے یہ پیشکش قبول کرنے کی بجائے اپنی پریکٹس دوبارہ شروع کرنے کو ترجیح دی۔ ان کی پریکٹس کے بارے میں ان کے ایک سینئر وکیل سرچمن لال سیتلواڈ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "جناح نے ہمیشہ، حتیٰ کہ اپنے جونیئر ہونے کے دنوں میں بھی خاصی آزادی اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کبھی فریقِ مخالف یا جج کو خود پر غالب نہیں آنے دیا۔" ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا یہ پیشہ ورانہ کمال اور بے باکی ان کے وسیع مطالعہ کی مرہونِ منت تھی۔

زندگی کے آخری دس برسوں میں، جب وہ بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے، ان کی ذمہ داریوں اور سرگرمیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا، کیونکہ اب وہ محض اپنے خاندان کے ذمہ دار نہیں تھے، ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ان کے خاندان میں شامل ہو چکے تھے اور انہیں دس کروڑ غیر منظم مسلمانوں کو غلامی کے گڑھوں سے نکال کر آزادی سے سرفراز کرنا تھا۔ وہ نہ صرف بوڑھے ہو گئے تھے، بلکہ علالت کے سبب کمزور بھی ہو گئے تھے مگر قوم کے لئے آزادی کی دُھن ان پر اس قدر سوار تھی کہ بہن کی التجاؤں اور ڈاکٹر کے مشوروں کے باوجود انہوں نے اپنا کوئی خیال نہ رکھا، بلکہ وہ ایسے مواقع پر کہا کرتے کہ "کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی جنرل نے ایسے وقت میں چھٹی کی ہو، جب اس کی فوج میدان جنگ میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہو۔" ایسے مواقع پر محترمہ فاطمہ جناح دلائل کے بجائے جذبات کا سہارا لیتیں اور کہتیں کہ آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ آپ کو اس کی مناسب دیکھ بھال کرنی چاہئے۔ اس پر وہ کہتے کہ فرد واحد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے۔ میں تو ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بقاء کے بارے میں پریشان ہوں۔ کیا تم جانتی ہو کہ مسلمانوں کا کیا کچھ خطرے میں ہے؟

ان کا قد پانچ فٹ ساڑھے دس انچ تھا۔ اور وزن ۱۱۲ پونڈ۔ قرار داد پاکستان کی منظوری کے بعد ان کی مصروفیات اتنی بڑھیں کہ یہ وزن رفتہ رفتہ کم ہونے لگا ایک دفعہ توریل گاڑی میں ہی شدید بیمار ہو گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے جسم کو کسی نے دہکتے ہوئے انگارے سے داغ دیا ہو۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد بتایا کہ ان کے پھیپھڑے کی جھلی پر ورم آگیا ہے اور انہیں کم از کم دو ہفتے تک لازمی طور پر

آرام کرنا چاہئے۔ جیسے ہی ڈاکٹر معائنہ کر کے گیا۔ محمد علی جناح نے جنہیں قوم نے اب قائد اعظم کہنا شروع کر دیا تھا، اپنی بہن سے کہا کہ یہ اجلاس بہت اہم ہے، میری وہاں موجودگی بہت ضروری ہے اور ایک میں ہوں کہ بستر میں جبری آرام کا پابند بنا دیا گیا ہوں۔ انہوں نے پندرہ روز کی بجائے صرف دو روز آرام کیا اور کام میں مصروف ہوگئے اور پھر انہوں نے اجلاس میں شرکت کی ایک گھنٹہ تک انتہائی مدلل تقریر کی۔ "میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔" محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب "میرا بھائی" میں لکھا۔ وہ مزید لکھتی ہیں،

"میں جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، دیکھتی کہ وہ بمشکل بسترِ علالت سے اٹھتے، ان کے چہرے پر تھکن اور اضمحلال کے آثار نمایاں ہوتے، حالانکہ وہ خاصا اسمارٹ لباس پہنتے تھے، سارا راستہ وہ نہایت خاموش رہتے، اس خاموشی کا مقصد خیالات کو مجتمع کرنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اپنی توانائی کا ایک ایک سانس بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پیرو کاروں اور مداحوں کی صفوں میں پہنچتے تو ان کی نگاہوں میں تھکاوٹ اور اداسی ہوتی تھی اور وہ دونوں طرف باری باری قدرے جھک جھک جاتے اور اپنی پارٹی کے لوگوں کے سلام قبول کرتے اور انہیں پُرجوش جوابی سلام کرتے چلے جاتے۔ ان کے قدم مضبوط ہوتے تھے اور ان کی آنکھیں امید کی روشنی سے جگمگاتی تھیں، وہ ڈائس پر چلے جاتے، قرآن حکیم کی چند آیات کی تلاوت اور مقامی رہنماؤں کی تقاریر کے بعد وہ چند قدم چل کر مائیک کے سامنے تشریف لے جاتے، اب وہ ننگی زمین پر بیٹھے ہوئے لاکھوں پُرجوش عوام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے، اور اس کے بعد وہ ایسے لب و لہجے اور آواز میں ان سے خطاب کا آغاز کرتے گویا ان پر بڑھاپا یا خرابیٔ صحت مطلق اثر انداز ہوئی ہی نہ ہو۔"

"وہ ایک ایسی روح تھے جو خدمت کے لئے بے قرار تھی اور وہ روح ایک ایسے جسم میں تھی جو کام اور خرابیٔ صحت سے ٹوٹ چکا تھا۔ کئی سال تک ان پر بخار کی سی کیفیت طاری رہی۔ بخار کے بار بار حملوں نے ان کے جسم کو لاغر کر دیا تھا۔"

ان کی اس اَن تھک جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ وہ اپنی عظیم بہن کے ہمراہ ایئرپورٹ سے گورنر جنرل ہاؤس جا رہے تھے اور ان کی گاڑی کو گھیرے میں لئے ہوئے پُرجوش اور مسرور ہجوم کو یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ ان کا ناقابل تسخیر قائد کس قدر علیل ہے۔ قوم آزادی کا جشن منا رہی تھی۔

خود قائد اعظم کے لئے یہ تکمیل کا ایک لمحہ تھا۔ منزل آگئی تھی، مگر سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ نیا سفر تھا تعمیر پاکستان کا سفر، قائد ایک سال کے بعد اس سفر کی تکمیل کی ذمہ داری ہمیں، اپنے بچوں، اپنی قوم کو سونپ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

اِن پر اعتماد کیجیے

اِن سے تعاون کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے

اِن اداروں کو
اپنا باقاعدہ ایجنٹ
مقرر کیا ہے

محمد حسین برادرز	کراچی ۷۷۲۳۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور — ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی — ۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد — ۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور — ۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان — ۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد — ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ — ۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ
سلمان برادرز	نوابشاہ — ۲۴۱۴
سعید بک سٹال	گجرات — ۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈز بکسٹال	سرگودھا — ۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور — ۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان — ۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر
رحمت بکسٹال	اوکاڑہ
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ — ۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

آنکھ مچولی خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

خط و کتابت کے لیے

ماہنامہ **آنکھ مچولی** - ڈی ۱۱۲ - سائٹ • کراچی ۱۶

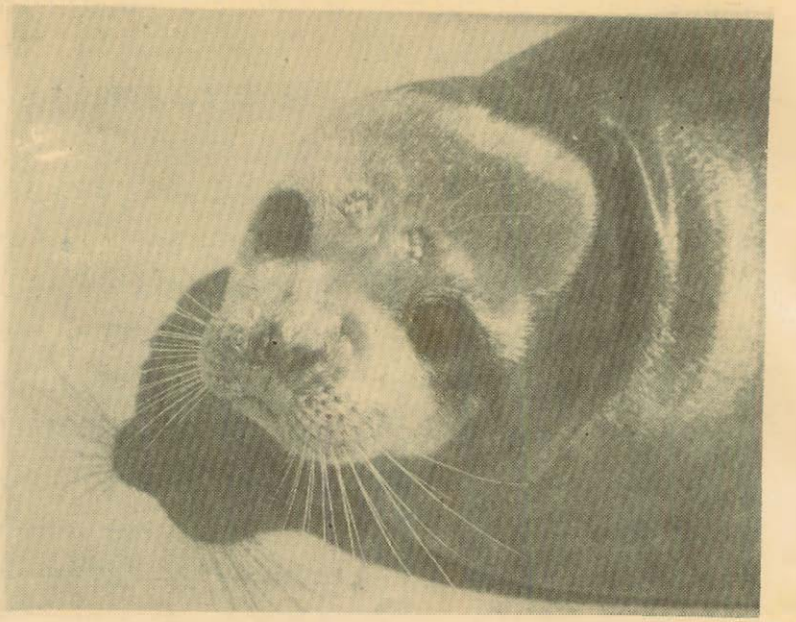

مونچھوں کا کمال

اخگر انوار اعوان

دریائی بچھڑا یا سیل (SEAL) تو آپ نے دیکھا ہی ہو گا۔ یہ دنیا کے مختلف سمندروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کی ایک خاص قسم ہے جسے رنگ سیل (RINGED SEAL) کہا جاتا ہے۔ شمال مشرقی فن لینڈ کی ایک جھیل "سینما" (SAIM-AA) میں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اپنے گدلے پن کی وجہ سے جھیل کا پانی بڑا تاریک ہے اور گرمیوں کی دھوپ میں بھی اس کی تہہ میں کچھ دیکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن یہ دریائی بچھڑے نہ صرف گرمیوں بلکہ سردیوں کی مدہم دھوپ اور اوپر کی سطح کے برف بن جانے کے باوجود پانی کی تہہ میں اپنا شکار تلاش کر سکتے ہیں اور ہر بچھڑا روزانہ کم از

کم چھ پاؤنڈ مچھلی کسی نہ کسی طرح شکار کر لیتا ہے۔

دریائی بچھڑوں کا اندھیرے میں شکار کر لینا کیسے ممکن ہے؟ ایکولوکیشن (ECHOLOCATION) یا آواز کی بازگشت پر کام کرنے والا نظام جسے جانوروں کا ریڈار سسٹم کہا جاتا ہے اس کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً ڈولفن مچھلی منہ سے خاص قسم کی آواز کی لہریں چھوڑتی ہے جو ٹھوس اجسام سے ٹکرا کر واپس آتی ہیں جنہیں ان کے سر میں موجود ملن (MELON) نامی ایک عضو وصول کرتا ہے۔ ملن میں تیل کی طرح کا ایک سیال بھرا ہوتا ہے جس میں خاصیت ہوتی ہے کہ وہ اس ٹھوس جسم کے مقام اور فاصلے کا تعین کر کے یہ معلومات مچھلی کے دماغ کو منتقل کر دیتا ہے۔ لیکن دریائی بچھڑوں کے سر میں "ملن" کی نوعیت کا کوئی عضو نہیں ہوتا۔ دریائی بچھڑے بھی اگرچہ قدرے ہلکی مگر سنی جانے کے قابل "ٹک ٹک" کی آواز خارج کرتے ہیں لیکن اس کی بازگشت کو ان کے کان نہیں سن سکتے۔ کیونکہ ان کے کان صرف خشکی پر ہی سننے کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی اصل توجیہ فن لینڈ یونیورسٹی کے ایک ماہر حیوانیات نے کی ہے۔ اس نے تحقیق و مشاہدے کے بعد معلوم کیا ہے کہ یہ دریائی بچھڑا آواز کی بازگشت کو ایک اور نظام کے ذریعے سنتا ہے۔ یہ نظام اس کی مونچھوں کو انٹینا (ANTEENA) کے طور پر بروئے کار لاتا ہے۔ ہر مونچھ کی جڑ کے ارد گرد ایک خول سا ہوتا ہے جس طرح پینے کی نلکی کے گرد بوتل ہمیں نظر آتی ہے۔ اس خول میں جیلی کی قسم کی ایک چکنائی بھری ہوتی ہے جو بارہ سو سے زائد اعصابی ریشوں کی مدد سے دماغ سے منسلک ہوتی ہے۔ جب آواز کی لہر مونچھوں سے ٹکراتی ہے تو خول میں موجود جیلی یہ تعین کر کے کہ شکار یا رکاوٹ کہاں اور کتنے فاصلے پر ہے دماغ کو مطلع کر دیتی ہے جس کی وجہ سے دریائی بچھڑے کے لئے پانی کی تاریکی کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی۔

دُنیا کی سب سے بڑی سیل

آپ نے شاید نہ دیکھی ہو مگر ایسی بھی ہے

دُنیا کی ۳۴ شناسا سیل کی اقسام میں سے قد آور ترین سیل
اسے ہاتھی سیل بھی کہتے ہیں، جزائر قطب شمالی میں پائی جاتی ہے
قد ۱۶½ فٹ ○ وزن ۲۲۷۰ کلوگرام ○ ہے نا حیرت کی بات؟

دُنیائے کرکٹ

ریکارڈ توڑے ہیں ہم نے، بنائے ہیں ہم نے

مشتاق محمّد

دُنیائے کرکٹ کا سب سے کم عمر
ٹیسٹ کھلاڑی، پاکستانی کرکٹ
ٹیم کا سابق کپتان اور ریکارڈ
قائم کرنے والے بیٹسمین
حنیف محمد خان کا بھائی

عمران خان

بیٹنگ اور بالنگ کے محاذ پر
بیک وقت ناقابلِ یقین کامیابیاں
جون ۱۹۸۳ء میں فیصل آباد کے
اسٹیڈیم میں بھارت سے ٹیسٹ میچ
کھیلتے ہوئے عمران خان نے ۱۱۷
رنز بنائے اور ۱۰ وکٹیں لیں۔

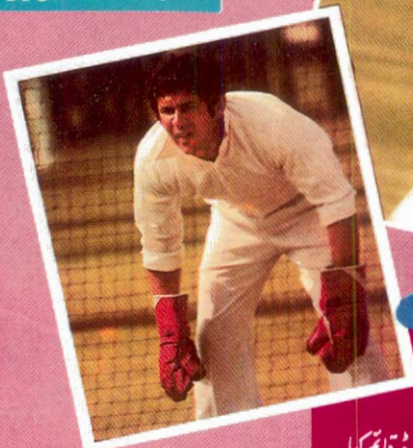

وسیم باری

۱۹۷۱ء میں انگلستان کے مقابلے میں
کھیلتے ہوئے آٹھ کیچ لئے۔ اسی طرح
ایک میچ میں سات ڈس مزلز کا عالمی ریکارڈ قائم کیا

سلیم واپس نہیں آئے گا

طاہر مسعود

سلیم کو اس گھر سے گئے ہوئے اب کئی مہینے ہو چکے ہیں لیکن کلثوم اسے بھولی نہیں ہے۔ کھیلتے کھیلتے اچانک پوچھ بیٹھتی ہے "پاپا! سلیم کب آئے گا؟"

"وہ آجائے گا بیٹا بہت جلد آئے گا" میں کہتا ہوں اور وہ میری بات کا یقین کر کے مطمئن

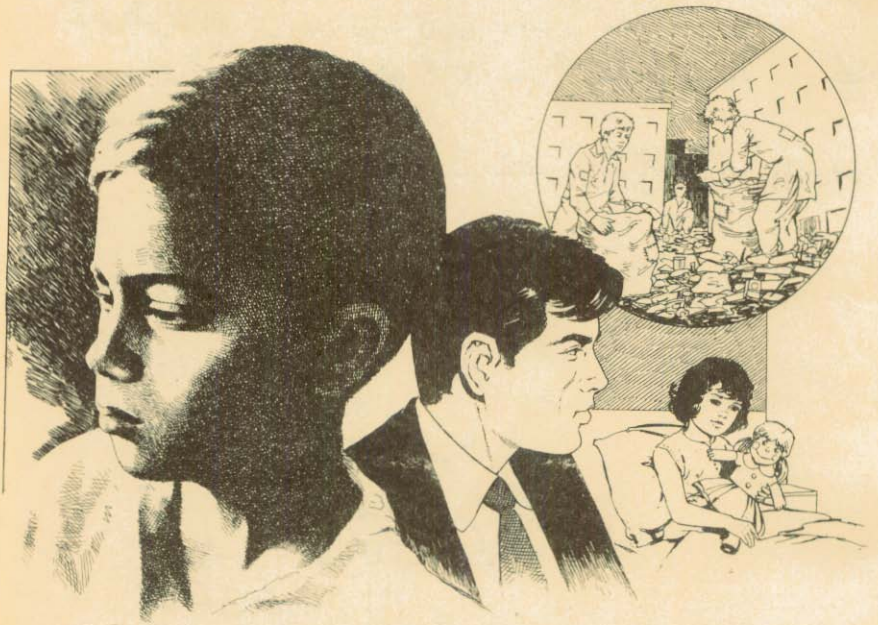

ہو جاتی ہے اور دوبارہ کھیل میں مگن ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ سلیم اب کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن یہ جھوٹ بولے بنا کوئی چارہ بھی نہیں۔

سلیم ایک غریب، بہت ہی غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ وہ ہمارے گھر میں ایک ملازم کی حیثیت میں آیا تھا۔ اور جب وہ آیا تھا تو انتہائی میلا کچیلا تھا۔ اس کے ناخنوں میں گندگی بھری ہوئی تھی، بال تیل

نہ پڑنے کی وجہ سے خشک اور بھورے ہوگئے تھے۔ جوتے جگہ جگہ سے ادھڑ چکے تھے اور کپڑوں سے بدبو آرہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یقیناً وہ ان افلاس کے مارے بچوں میں سے ہے جو گندگی کے ڈھیر میں سے ٹوٹے کھلونے، پرانی بوتلیں اور سوکھی ہوئی روٹیاں جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور جب بھی میں ایسے لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل بہت دُکھتا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ان بچوں کے لئے کچھ کروں۔ کچھ ایسا کہ انہیں اس ذلت بھری زندگی سے نجات مل جائے اور وہ بھی معاشرے میں عزت سے رہنے کے قابل ہو سکیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ملک میں ایسے بچوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے بلکہ شاید اس سے کچھ زیادہ ہی ۔ اور ایک اکیلا آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب بھی اپنی الجھنوں سے نجات ملی، میں ان غریب بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ کروں گا ضرور۔ لیکن نہیں معلوم کیوں سلیم کو اپنے گھر پہ دیکھ کر میرے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں جاگا۔ وہ مجھے انتہائی گندا اور فضول لڑکا لگا۔ میں نے بیزاری سے اپنی بیوی سے کہا۔

"اس لڑکے سے کہہ دو کہ صاف ستھرا رہا کرے۔ اگر اسے یہاں رہنا ہے تو..... مجھے گندے بچے بالکل پسند نہیں ہیں۔"

اور یہ کہہ کر میں کلثوم کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "پاپا! یہ کون ہے۔"

"یہ سلیم ہے۔"

"یہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"یہ کام کرے گا چندا۔"

"یہ اپنے گھر نہیں جائے گا؟"

"نہیں اب یہ ہمارے ہی ساتھ رہے گا۔"

"پاپا..... اس کی امی روئیں گی!"

"نہیں چاند..... اس کی امی نہیں روئیں گی۔"

"اس کے پاپا روئیں گے!"

"نہیں بیٹا..... اس کے پاپا نہیں روئیں گے۔"

میں نے کلثوم کے سوالوں سے تنگ آ کے اسے گود سے اتار دیا۔

سلیم کچھ ہی روز میں بالکل بدل گیا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے ہوگئے۔ ناخنوں سے گندگی دور ہوئی اور چہرے پر بھی رونق آگئی۔ وہ خوش مزاج لڑکا تھا۔ بلا کا محنتی بھی تھا۔ ہر کام بھاگ بھاگ

کے کیا کرتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر جو کام میں جُٹتا تو رات گئے تک جُٹا رہتا۔ باورچی خانے کے برتنوں سے لے کر کمروں کی صفائی تک، سارے کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ اور جب اسے فرصت ہو جاتی تو پھر وہ کلثوم کے ساتھ کھیلتا تھا۔ کلثوم بھی اس سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ میری بیوی بھی اس سے بہت خوش تھی اس کے آنے سے اسے سہولت ہو گئی تھی۔ ایک صرف میں ہی تھا کہ جسے سلیم سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ میرا موڈ آف ہو جاتا تھا۔ حالاں کہ اس نے مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ کوئی بات تھی اس میں جو مجھے تکلیف دیتی تھی۔ بے چین کئے رکھتی تھی۔ رات کو جب ہم لوگ ٹی وی دیکھ رہے ہوتے تھے وہ بھی آکر فرش پر بیٹھ جاتا تھا..... لیکن جب تک وہ بیٹھا رہتا تھا، میں اپنے اندر سخت اضطراب محسوس کرتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا وہ فوراً وہاں سے چلا جائے۔ یا شام کو جب میں گیلری میں کرسی بچھائے باہر سڑک کا منظر دیکھ رہا ہوتا تھا تو وہ چپکے سے ریلنگ سے لگ کر کھڑا ہو جاتا تھا..... ایسے موقعوں پر وہ دھیمے دھیمے سروں میں کوئی گیت گنگناتا تھا۔ مجھے اس گیت کے بول تو سمجھ میں نہیں آسکے لیکن اسے اپنے قریب پاکر جھنجھلاہٹ سی محسوس ہونے لگتی تھی۔

"سلیم!" میں کرخت لہجے میں کہتا۔

"جی صاحب جی۔" وہ سہم کر جواب دیتا۔

"نیچے جاؤ۔ یہاں کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اور وہ فوراً میرے حکم کی تعمیل کرتا تھا۔

سلیم..... دن بدن میرے لئے مسئلہ بنتا جارہا تھا۔ اور ایسا کیوں تھا..... یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ وہ بہرحال نوکر تھا اور جس طرح گھروں میں نوکروں کو رکھا جاتا ہے، اسی طرح وہ بھی یہاں تھا۔ کھانا فرش پر بیٹھ کر کھاتا تھا، اپنے کپڑے خود دھوتا تھا، برتن توڑنے پر ڈانٹ سنی پڑتی تھی، غلطی کرنے پر جھڑکیاں سہنی پڑتی تھیں۔ میری بیوی ویسے بھی اسے سخت ڈسپلن میں رکھتی تھی۔ اس کی عجیب عادت یہ تھی کہ جب اسے ڈانٹ پڑتی تھی تو وہ اپنا سر جھکا لیا کرتا تھا اور اس وقت تک سر جھکائے کھڑا رہتا تھا جب تک اسے کہہ نہ دیا جاتے کہ اچھا اب بھاگ جاؤ۔ اتنی اطاعت گزاری کے بعد بھی میں اس کو پسند نہیں کر پایا تھا..... کیوں؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

انہی دنوں مجھے خدا جانے کیسے یہ شبہ رہنے لگا کہ وہ چیزیں چراتا ہے اور موقع پاکر فرج سے کھانے پینے کی اشیاء غائب کر دیتا ہے۔ دو ایک بار مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ پرس میں سے رقم کم ہو گئی ہے۔ بالآخر ایک دن میں نے اسے پکڑ ہی لیا۔ اس نے فرج سے دودھ کا گلاس نکال کر پی لیا تھا۔ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ دودھ اس نے نہیں پیا تھا۔ اس پہ مجھے اور غصہ آیا۔ اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں

آ سکی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا تو ایک ہی منظر نگاہوں کے سامنے لہرانے لگتا تھا۔ میں نے اس کے دونوں کانوں کو مٹھیوں میں جکڑ رکھا ہے، اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں۔ صبح میں سو کر اٹھا تو رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اسی شام دفتر سے واپسی پر میں نے بیوی سے کہا۔ "میرا خیال ہے سلیم کو فارغ کر دو۔"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا خرابی ہے اس میں؟ محنتی ہے، ایماندار ہے۔ ایسے ملازم کہاں ملتے ہیں۔"

"لیکن وہ مجھے پسند نہیں ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں، وہ تمہیں کیوں پسند نہیں ہے۔" بیوی نے پوچھا۔

"پلیز، مجھ سے بحث نہ کرو۔" میں یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ سلیم کو اگلے ہی دن میری بیوی نے فارغ کر دیا۔ اور اب تو اسے گئے ہوئے بھی کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ کلثوم جو اس کی دوست بن چکی تھی، اب بھی پوچھتی ہے "پاپا! سلیم کب آئے گا؟" میں کہتا ہوں "بہت جلد۔ وہ بہت جلد آجائے گا۔" حالانکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ میں تنہائی میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس سے مجھے کیا پرخاش تھی۔ تو بہت سوچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

میں اب بھی ان غریب بچوں کو دیکھتا ہوں جو گندگی کے ڈھیر میں سے ٹوٹے ہوئے کھلونے اور سوکھی ہوئی روٹیاں ڈھونڈتے ہیں تو میرا دل بھر آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ زندگی کی الجھنوں سے کبھی فرصت ملی تو ان بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ کروں گا ضرور۔

تم سلامت رہو ہزار برس

مرسلہ:۔ غلام عباس طاہر

کمبرلینڈ کے مشہور ڈاکٹر وکٹر فلیچر حسب ذیل ہدایات پر عمل درآمد کو عمر کی درازی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

۱۔ شراب اور تمباکو سے پرہیز کریں۔
۲۔ صرف ناک سے سانس لیں۔
۳۔ پوری نیند لیں۔
۴۔ کمرہ بالکل بند نہ کریں۔
۵۔ بغیر بھوک کے کھانا نہ کھائیں۔
۶۔ غذا خوب چبا کر کھائیں۔
۷۔ زیادہ نہ کھائیں۔
۸۔ دانت صاف رکھیں۔
۹۔ روزانہ غسل کریں۔
۱۰۔ روزانہ ورزش کریں۔
۱۱۔ لباس موسم کے لحاظ سے پہنیں۔
۱۲۔ کچھ نہ کچھ آرام ضرور کریں۔

تحفۂ عقیدت نذرِ قائدِ اعظم

پینسل اسکیچ۔ مرزا انوار الحق۔

اگرچہ افق پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور قوم کے نام پیغام دیتا ہوں کہ اپنے دلوں میں جذبہ اور جوش و خروش پیدا کیجئے اور حوصلے اور امید کے ساتھ اپنا کام کرتے جایئے۔ انشاء اللہ کامیابی ہماری ہے۔ کیا ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کی تاریخ اولوالعزمی، عالی حوصلگی اور مستقل مزاجی کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پس مشکلوں، رکاوٹوں اور مصیبتوں کے باوجود آگے بڑھتے جایئے۔ مجھے یقین ہے کہ سات کروڑ کی ایسی متحدہ قوم جو عظیم ارادے کی مالک ہو، عظیم تہذیب رکھتی ہو، عظیم تاریخ کی وارث ہو۔ اسے کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہئے۔ اب یہ آپ پر ہے کہ کام کریں۔ کام۔ کام۔ کام۔ کامیابی ہمارا مقدر ہے اور اپنا یہ نعرہ کبھی نہ بھولئے۔ اتحاد، ایمان، نظم۔

مرسلہ ..... مرزا انوار الحق
دھانا نوالی، ضلع سیالکوٹ

بے حقیقت کچھ

عقیل عباس جعفری

مغالطہ :۔

پانی پیئے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔

حقیقت :۔

یہ تو درست ہے کہ پانی ہر جاندار کے جسم کی بنیادی ضرورت ہے۔ تاہم تمام جاندار پانی نہیں پیتے۔ چھپکلی کی نسل کے کئی جاندار ایسے ہیں جو پانی اپنے جسم کے ذریعہ جذب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ جاندار جو غذا کھاتے ہیں ان میں پایا جانے والا پانی، ان کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ خشک علاقوں میں رہنے والے بعض جاندار جو پودے کھاتے ہیں وہ انہی میں پائی جانے والی نمی پر انحصار کرتے ہیں۔

اسی طرح بعض جانور مثلاً زرافہ اور بھیڑ وغیرہ بعض اوقات کئی ہفتے، بلکہ مہینہ بھی پانی پیئے بغیر گزار دیتے ہیں۔

حوالے :۔

1 ... Facts & Fallacies by Rhoda & Leda Blumberg- P12

2 ... Don,t you Believe It by Gyles Brandreth– P16

مغالطہ :۔

بھینسے سرخ رنگ دیکھ کر مشتعل ہو جاتے ہیں۔

حقیقت :۔

انسان کے علاوہ صرف چند جانور ایسے ہیں جو رنگوں میں تمیز کر سکتے ہیں۔ مگر بھینسا ان میں شامل نہیں ہے۔

در حقیقت بھینسا، رنگ کور یا کلر بلائنڈ ہوتا ہے۔ جب اس کے سامنے سرخ رنگ کا کپڑا لہرایا جاتا ہے تو وہ سرخ رنگ کی وجہ سے نہیں، بلکہ کپڑا لہرانے اور

تماشائیوں کے شور شرابے کی وجہ سے مشتعل ہو جاتا ہے۔ اور عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ سرخ رنگ کی وجہ سے مشتعل ہوا ہے۔

حوالے :-

1 ... The Dictionary of Misinformation by Tom Burnam P-38

2 ... Facts and Fallacies by Rhoda & Leda Blumberg P-19

3 ... Banana,s Don,t Grow on Trees by Joseph Roseubloom P-28

مغالطہ :-

قطب جنوبی اور قطب شمالی، روئے زمین کے سرد ترین مقامات ہیں۔

حقیقت :-

یہ درست ہے کہ قطب جنوبی اور قطب شمالی، جنہیں قطبین کہا جاتا ہے، روئے زمین کے چند سرد ترین مقامات میں شامل ہیں مگر شمالی سائبریا اور وسطی گرین لینڈ کے بعض مقامات کا درجۂ حرارت، قطبین سے کہیں زیادہ کم ہوتا ہے۔

ایک سال کے اوسط سرد ترین درجۂ حرارت کے حوالے سے زمین کا سرد ترین آباد مقام سائبریا کا ایک گاؤں "اوئی مایاکون" (Oymyakon) ہے۔ جہاں ۱۹۶۴ء میں اوسط درجۂ حرارت منفی ۱۴۱ء۷ درجہ سینٹی گریڈ (منفی ۹۶ درجہ فارن ہائیٹ) تھا۔ یہ گاؤں آرکٹک سرکل کے جنوب میں ۲۰۰ میل (۳۲۱ء۸۶ کلو میٹر) کے فاصلہ پر واقع ہے۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۸۳ء کو براعظم انٹارکٹیکا کے مقام واسٹوک پر منفی ۱۲۸ء۶ درجے فارن ہائٹ (منفی ۸۹ء۲ درجے سینٹی گریڈ) درجۂ حرارت ریکارڈ کیا گیا تھا۔ جواب تک روئے زمین پر ریکارڈ کیا جانے والا کم سے کم درجۂ حرارت ہے۔ واسٹوک، قطب جنوبی سے ۹۰۰ میل (۱۴۴۸ء۳۷ کلو میٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔

حوالے :-

1 ... Facts and Fallacies by Rhoda &Leda Blumberg P-114

2 ... Guiness Book of Records -1990 Editor Donald Mc arlan P-63

مغالطہ :-

اسکیموز جن خاص قسم کے مکانوں میں رہتے ہیں انہیں اِگلُو کہا جاتا ہے۔

حقیقت :-

برف کے بلاکس سے بنے ہوئے گنبد نما کا اسٹرکچر کو عام طور پر "اِگلُو" کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان مکانات میں اسکیموز رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسکیموز، اس شکل و صورت کے کسی مکان میں نہیں رہتے ہیں۔ اور نہ انہوں نے کبھی اس شکل و صورت کا کوئی مکان دیکھا ہوتا ہے۔ ان کی زبان میں "اگلو" کے معنی ہیں گھر۔ چنانچہ وہ جس شکل و صورت کے گھر میں بھی رہتے ہیں اسی کو "اِگلُو" کہا جاتا ہے۔

حوالے :۔

More Misinformation by Tom Burnam P-126

مغالطہ :۔

۱۹۶۰ء کے روم اولمپکس میں محمد علی نے ہیوی ویٹ باکسنگ میں سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔

حقیقت :۔

جب بھی محمد علی اور روم اولمپکس کا ذکر آتا ہے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے محمد علی نے روم اولمپکس میں ہیوی ویٹ باکسنگ میں سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

۱۹۶۰ء کے روم اولمپکس میں ہیوی ویٹ باکسنگ میں سونے کا تمغہ اٹلی کے فرانکو ڈی یکولی نے حاصل کیا تھا۔ محمد علی نے، جو ان دنوں کیسیس کلے ہوا کرتے تھے، ان اولمپکس میں "لائٹ ہیوی ویٹ باکسنگ" میں سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔

حوالے :۔

More Misinformation by Tom Burnam P-134

مغالطہ :۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

یہ شعر میر تقی میر کا ہے۔

حقیقت :۔

مشہور محقق جناب کالیداس گپتا رضا اپنی کتاب "سہو و سراغ" میں لکھتے ہیں۔

عام طور پر یہ شعر میر تقی میر کے نام سے مشہور ہے۔ بلکہ ان کے ایک قلمی نسخے میں بھی (جواب چھپ گیا ہے) موجود ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر ذرہ برہان پوری کا ہے۔ میر ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے جب کہ ذرہ کا سال وفات ۱۷۸۵ء تسلیم کیا جاتا ہے۔ مزید براں یہ شعر ذرہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلیات میں شامل ہے جو کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) کی زینت ہے۔

حوالے :۔

سہو و سراغ از کالی داس گپتا رضا صفحہ ۱۳۱

مغالطہ :۔

پنگوئن قطب شمالی پر پائے جاتے ہیں۔

حقیقت :۔

اگر آپ پینگوئن کی تلاش میں قطب شمالی کا رخ کریں گے تو یقیناً آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔

پینگوئن قطب شمالی کے بجائے قطب جنوبی اور انٹارکٹیکا میں پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ جنوبی افریقہ، جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے بعض سرد مقامات بھی پینگوئن کا وطن ہیں۔

حوالہ :-

Facts and Fallacies by Rhoda & Leda Blumberg P-30

مغالطہ :-

آسٹریلیا اور انگلستان کے درمیان کھیلے جانے والی ٹیسٹ سیریز میں جیتنے والی ٹیم کو "ایشز" بطور انعام ملتی ہے۔

حقیقت :-

آسٹریلیا اور انگلستان کے درمیان کھیلے جانے والی ٹیسٹ سیریز جیتنے والی ٹیم یقیناً ایشز ٹرافی کی حقدار کہلاتی ہے۔ مگر "ایشز" لارڈز کرکٹ گراؤنڈ میں واقع امپریل کرکٹ میموریل میوزیم میں ہی محفوظ رہتی ہے۔

اس ٹرافی کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ جب ۱۸۸۲ء میں آسٹریلیا نے اوول کے میدان میں انگلستان کو غیر متوقع طور پر شکست دی تو لندن کے اخبار دی اسپورٹنگ ٹائمز نے ایک فرضی تعزیت نامہ چھاپا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا "انگلش کرکٹ کا جنازہ نکل چکا ہے، اس کا جسد خاکی نذر آتش کیا جاچکا ہے۔ اور اب اس کی راکھ ایشز Ashes آسٹریلیا لے جائی جارہی ہے۔

اگلے سال جب انگلستان کی ٹیم آسٹریلیا پہنچی تو اس کے کپتان آئی وو بلائی (Ivo Bligh) نے ازراہ تفنن کہا کہ وہ اور ان کی ٹیم کے ارکان یہاں اس راکھ کے حصول کے لئے آئے ہیں۔ جو سال گزشتہ آسٹریلیا کے کھلاڑی انگلستان کو شکست دے کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

چنانچہ ملبورن ٹیسٹ جیت کر انگلستان نے ٹیسٹ سیریز جیت لی تو انگلستان کی دو خواتین نے اس گراؤنڈ کی ایک بیل کو جلا کر راکھ کیا اور اس کی راکھ کو مٹی کے ایک خوبصورت خاکدان میں رکھ کر، انگلستان کے کپتان کو پیش کر دیا اور کہا "یہ وہ راکھ ہے جس کی تلاش میں آپ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچے ہیں" آئی وو بلائی نے یہ خاکدان شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

جب تک آئی وو بلائی زندہ ہے، یہ خاکدان انہی کے پاس رہا۔ تاہم ۱۹۲۷ء میں ان کی وفات کے بعد یہ خاکدان لارڈز کے امپریل کرکٹ میموریل میوزیم میں محفوظ کر دیا گیا۔ اسی خاکدان کی یاد میں دونوں ممالک کے درمیان ٹیسٹ سیریز کو ایشز کہا جاتا ہے لیکن یہ ٹرافی آج تک کسی ملک کو نہیں دی گئی۔ یہ ٹرافی لارڈز ہی میں رہتی ہے اور فاتح ملک یہ تصور کر لیتا ہے کہ ایشز اب اس کی ملکیت ہے۔

حوالہ :-

1- Facts and Fallacies by Rhoda & Leda Blumberg P-106

کرکٹ۔ تاریخ، شخصیات، ریکارڈز از ضیا الرحمٰن ضیاء شیخ ذکی الدین صفحہ ۸۱ تا ۸۵

مغالطہ :۔

آسمان نیلا ہے

حقیقت :۔

آسمان ہم سب کو نیلا نظر آتا ہے۔ مگر کیا آپ کو علم ہے کہ آسمان نیلا نہیں بلکہ سیاہ ہے۔

سورج کی روشنی ہم تک زمین کے گرد موجود کرۂ ہوائی سے گزر کر پہنچتی ہے، اور سورج کی روشنی میں قوس وقزح کے سب ہی رنگ موجود ہوتے ہیں۔

چونکہ نیلے رنگ کی طول موج WAVE LENGTH باقی دوسرے رنگوں کی طول موج (WAVE LENGTHS) کی بہ نسبت کم ہوتی ہے۔ اس لئے یہ رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں آسمان نیلا نظر آنے لگتا ہے۔

جن خلانوردوں نے زمین کی کشش سے آزاد ہو کر خلا میں قدم رکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ آسمان کا رنگ بالکل سیاہ ہے۔

حوالے :۔

1 .Don,t You Believe It by Gyles Brandreth P-27

2 ... Facts and Fallacies by Rhoda & Leda Blumberg P-133

مغالطہ :۔

ہر سال جو چار پر تقسیم ہو جائے، لیپ کا سال ہوتا ہے۔

حقیقت :۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ایک سال ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے پر اور ایک دن ۲۴ گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے اور یوں ہر چار سال کے بعد ۲۴ گھنٹے کا اضافہ ہو جاتا ہے جو ایک دن کے اضافے سے پورا کر لیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سال ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۸ منٹ ۳۸ سیکنڈ پر اور ایک دن ۲۳ گھنٹے ۵۶ منٹ ۴ سیکنڈ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح جو حسابی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اسے رفع کرنے کے لئے یہ حل نکالا گیا ہے صدی کا فقط وہ سال لیپ کا سال شمار ہو گا جو ۴۰۰ پر پورا تقسیم ہو۔ مثلاً ۲۰۰ء ۲۴۰۰ء یا ۶۸۰۰ء وغیرہ وغیرہ ۲۰۰۰ء ۱۸۰۰ء ۱۹۰۰ء یا ۲۱۰۰ لیپ کے سال شمار نہیں ہوں گے حالانکہ یہ ۴ پر تقسیم ہوئے ہیں۔

حوالے :۔

1 ... Don,t You Believe It by Graham and Sylvana Nown P- 59

2 ... The Dictionary of Misinformation by Tom Burnam P-152

سرد موت

رچرڈ شیئرز ، ترجمہ منیر احمد راشد

وہ موسم گرما کا شدید ترین دن تھا۔ آسٹریلیا کے شہر ملبورن میں درجۂ حرارت ۱۰۷ ڈگری تک جا پہنچا تھا۔ یہ ۱۴ جنوری ۱۹۸۱ء کا ذکر ہے جب اسکول کے بچے اپنی آدھی چھٹیاں گزار چکے تھے۔ جوائس لین ہوپکنز بہت دیر سے اپنے دو بیٹوں، تیرہ سالہ لی اور بارہ سالہ ڈینئل اور ان کے مشترکہ دوست، بارہ سالہ کارل پاؤل کی باتیں سن رہی تھی، جو بار بار گرمی کی شدت کی شکایت کر رہے تھے۔

شام کو کہیں جاکر موسم تھوڑا سا خوشگوار ہوا۔ چھ بجے کی خبروں میں موسم کی شدت اور لوگوں کی مصروفیات کا بتاتے ہوئے جب سٹی اسکوائر کے فوارے کا منظر دکھایا گیا جہاں دن بھر کی گرمی کے مارے درجنوں لڑکے اب خوشی سے چھینٹے اڑاتے پھر رہے تھے تو مسز ہوپکنز نے سوچا کہ ڈینئل وغیرہ کو بھی اس جگہ کی سیر کرانا چاہیے۔

سات بجکر کچھ ہی منٹ ہوئے ہوں گے جب وہ لوگ سٹی اسکوائر پہنچے۔ یہاں تین چیزیں خاص طور پر قابل ذکر تھیں۔ ایک تو مستطیل کی شکل کا تالاب، ایک خوب صورت مرکزی فوارہ اور پانی کی ایک

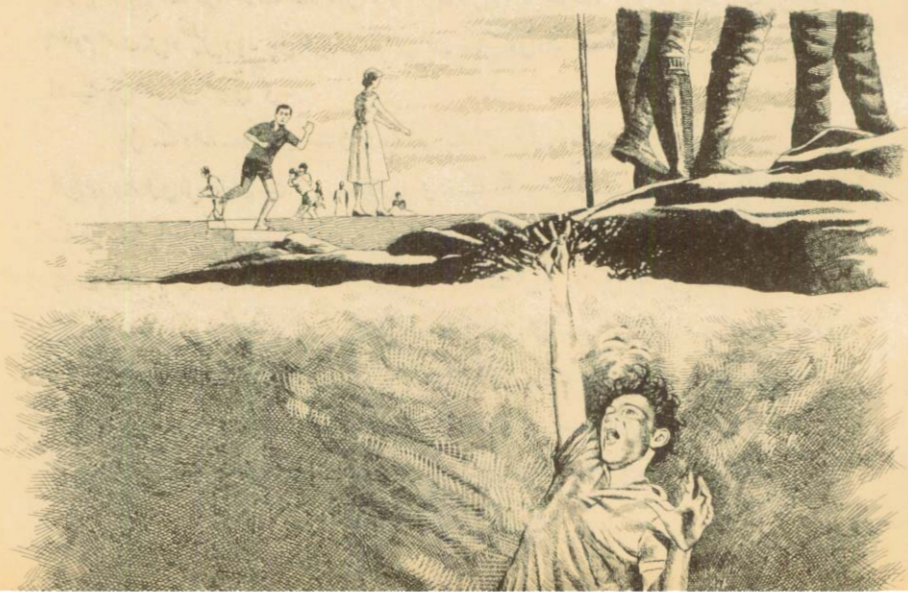

پندرہ فٹ کی دیوار جو آبشار کی مانند تالاب میں بنی ہوئی سیڑھیوں اور پتھر کے بڑے بڑے بلاکوں کے اوپر گرتی تھی۔ ایک دوسرے پر پانی اڑاتے ہوئے بچوں کی پُر مسرّت قلقاریوں کی وجہ سے ماحول بڑا جاندار لگ رہا تھا۔

لی اور ڈینئل پتھر کے بلاکوں کے گرد چل رہے تھے تاکہ اس نیچی دیوار تک پہنچ سکیں، جہاں سے پانی تک رسائی حاصل کرنا آسان تھا، مگر مناسب صحت والے بارہ سالہ کارل پاؤل نے، جو اس وقت ٹی شرٹ اور نیکر پہنے ہوئے تھا، ایک مختصر راستہ منتخب کیا اور کولہوں تک گہرے پانی میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا فوارے کے قریب پتھروں کے اوپر سے جانے لگا۔ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے دوست لی کو پکارا۔ لی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ شدتِ حیرت سے مبہوت سا کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ایک لمحہ پہلے تک ہاتھ ہلاتا ہوا کارل اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔ یوں جیسے اسے کسی بڑی وہیل مچھلی نے ہڑپ کر لیا ہو۔

لی کو جونہی کسی گڑبڑ کا احساس ہوا اس نے فوراً اپنے دوست کے پیچھے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ فوارے کی تہہ کے ساتھ بلبلے بناتے ہوئے پانی کی وجہ سے کسی چیز کا دکھائی دینا خاصا مشکل تھا لیکن پھر بھی لی نے ایک تین فٹ چوڑے شگاف کا پتہ چلا لیا اور اپنی حفاظت کے بارے میں سوچنے میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ سر کے بل پانی سے بھری ہوئی اس سرنگ کے اندر کود گیا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ مارتے ہوئے اچانک اس کا ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ کارل کا چہرہ ہے۔ لی نے فوراً اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا مگر پانی کے تیز دھارے نے کارل کو نہ صرف اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا بلکہ اسے بھی ایک نامعلوم سمت میں دھکیل دیا۔ پانی کا یہ تیز بہاؤ اس موٹر کے چلنے کی وجہ سے تھا جو بہت پریشر سے فوارے کے ذریعے پانی فضا میں بکھیرتی تھی۔

پانی کے دھارے کی وجہ سے لی بڑے زور سے اس سرنگ کی تہہ سے ٹکرایا تھا اور وہاں پر موجود کانچ اور دیگر ایسی ہی چیزوں سے اس کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ تب لی نے واپسی کا راستہ پکڑا اور تیز بہاؤ کے خلاف تیرتا ہوا سرنگ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہاں ایک اور مصیبت اس کی منتظر تھی۔ یہ سیمنٹ کے دو پائپ تھے، جو برابر برابر سرنگ کی ایک دیوار سے نکل کر دوسری دیوار میں غائب ہو گئے تھے اور ان کے درمیان اتنی سی بھی جگہ نہیں تھی کہ کوئی دُبلا پتلا لڑکا اس میں سے گزر سکتا۔ ایک لمحے کے لئے تو لی کے دماغ میں یہ ہولناک خیال پیدا ہوا کہ وہ اس سرنگ میں پھنس گیا ہے، لیکن اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور پائپوں کے درمیان سے نکلنے کی جگہ تلاش کرتا رہا۔ یہ پائپ دراصل انگریزی حرف "Y" کی لیٹی ہوئی شکل میں وہاں نصب تھے۔ لی نے جونہی کھلی جگہ تک رسائی حاصل کی وہ فوراً اوپر کی طرف تیرتا ہوا

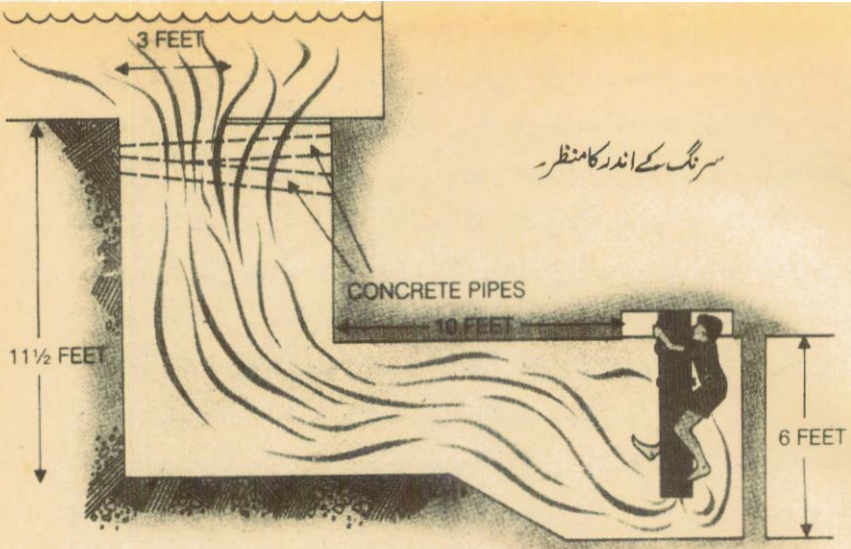

سرنگ کے اندر کا منظر۔

سرنگ کے منہ سے باہر نکلا اور پانی کی سطح پر آ گیا۔ اس کی بند مٹھی میں ابھی تک کارل کے بال دبے ہوئے تھے۔

نیچے پانی میں کارل یوں چکر کھا رہا تھا جیسے کپڑے واشنگ مشین میں۔ وہ صحیح سمت کا احساس بھی کھو چکا تھا۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس عمودی سرنگ سے جس میں کہ وہ گرا تھا ایک دوسری افقی سرنگ میں پہنچ چکا ہے۔ اس نے سوچا، "یہ تو میں گٹر لائن میں پھنس گیا ہوں۔ یہ سیدھی دریا میں جا گرے گی، اس کا مطلب ہے، میں موت کی طرف جا رہا ہوں۔" اس احساس کے ساتھ ہی خوف کی ایک لہر اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی، اور وہ جان بچانے کے لئے بے مقصد اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

چودہ فٹ اوپر، گرم شام کے ملگجے اندھیرے میں، لی ہوپکنز کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے لباس سے ابھی تک پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ چیختا ہوا اپنی ماں کی طرف دوڑا۔

"امی کارل ڈوب گیا ہے۔" وہ برابر یہی جملہ دہرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی جوائس لین ہوپکنز سمجھ گئی تھی کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے چلّا کر کہا

"فوراً پولیس کو بلاؤ، فائر بریگیڈ کو اطلاع کرو، جلدی کرو شاباش جلدی۔"

لی شام کی سیر کرنے والوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا تیزی سے سٹی اسکوائر کے نزدیک واقع ٹاؤن ہال کی طرف دوڑا، جہاں ایک پولیس کانسٹیبل ڈیوٹی پر موجود تھا۔

"میرا دوست فوارے کے تالاب میں ڈوب گیا ہے۔ براہِ کرم آپ اس کی مدد کریں۔" ہانپتے

ہوئے لی نے جلدی جلدی کہا۔ سپاہی نے فوراً اپنے واکی ٹاکی پر مشرقی ملبورن کے فائر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی۔ فائر مین، سینتیس سالہ گیری کرونن اور انتالیس سالہ جان روڈا نے شام سات بج کر تینتیس منٹ پر یہ کال سنی اور صرف تین منٹ کے بعد وہ اپنے چھ ساتھیوں سمیت ایک میل کا فاصلہ طے کر کے حادثے کی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں متجسس لوگوں کا ایک بڑا ہجوم پہلے ہی جمع ہو چکا تھا۔

کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر کرونن اور روڈا نے گیس سلنڈر اپنی پشت پر باندھے اور وہ ماسک چہروں پر چڑھا لئے جو وہ دھوئیں سے بھری ہوئی عمارتوں میں داخل ہونے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ آلات حالانکہ پانی کے اندر استعمال کے لئے نہیں بنائے گئے تھے مگر انہوں نے فوارے کے گرد ایک آزمائشی چکر لگا کر اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ یہ آلات یہاں بھی کام دے سکتے ہیں۔

اسی دوران میں پولیس نے اسکوائر کی انتظامیہ کا ایک آدمی ڈھونڈ نکالا تھا۔ جس نے فوراً فوارے کو چلانے والی موٹر بند کر دی تھی۔ اس طرح اب پانی بالکل ساکن ہو گیا تھا ..... گیس سلنڈر کی وجہ سے کرونن پانی سے ہلکا ہو گیا تھا اور نیچے کی طرف جانا مشکل ہو رہا تھا۔

اسے نیچے پانی میں رکھنے کے لئے روڈا اس کے کندھوں پر کھڑا ہو گیا تھا جبکہ کرونن ہاتھوں پیروں سے ٹٹول کر اس سرنگ کے محل وقوع کا اندازہ کر رہا تھا۔ اس کوشش میں اس نے افقی سرنگ کا سوراخ بھی دریافت کر لیا تھا۔ مگر اتنے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اکیلے جانا بہت خطرناک ہو سکتا تھا، اس لئے وہ واپس باہر آ گیا۔ دونوں فائر مین تھوڑی دیر بعد دوبارہ سرنگ میں داخل ہوئے۔ کافی دیر تک مزید کوشش کے بعد بھی جب انہیں کامیابی نہ ہوئی تو وہ لوگ واپس پانی کی سطح پر آ گئے۔ باہر موجود پولیس نے انہیں مشورہ دیا کہ اب مزید کوشش بے کار ہے، انہیں تلاش ختم کر دینی چاہئے، کیونکہ بچے کو ڈوبے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور اس کی موت یقینی تھی۔ وہاں جمع ہو جانے والا ہجوم بھی آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ حتیٰ کہ ٹیلی ویژن کا عملہ بھی جو واقعے کی کوریج کے لئے آیا تھا، اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

ہر شخص کارل کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ کارل زندہ تھا اور باہر سے آنے والی کسی مدد کا انتظار کر رہا تھا۔ ہوا یوں کہ جیسے ہی پانی کے تیز ریلے نے اسے افقی سرنگ میں دھکیلا اور وہ چکر کھاتا ہوا اس کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگا تو اس نے جان بچانے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے۔ اس کوشش میں اس کا ہاتھ سرنگ کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے ناخنوں کو دیوار میں گاڑنے کی کوشش کی مگر دیوار اتنی ہموار اور چکنی تھی کہ اسے اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔ پھر اچانک وہ کسی گول سی شے سے ٹکرایا۔ یہ ایک موٹا پائپ تھا جو سرنگ میں آڑا کھڑا تھا۔ پائپ کی وجہ سے کارل کے بہنے کی رفتار میں کمی آئی اور اسے سنبھلنے کا موقع ملا تو وہ فوراً اس پائپ سے چمٹ گیا اور تیزی سے اوپر کی

طرف چڑھنے لگا تاکہ تازہ ہوا میں سانس لے سکے، مگر کچھ ہی اوپر جاکر اس کا سر سخت چھت سے ٹکرایا۔ وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

کارل نے بہت دیر سے سانس روک رکھی تھی۔ اس وجہ سے اسے دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑے بُری طرح دباؤ محسوس کر رہے تھے اور اسے سانس روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ سانس لینے کا مطلب تھا کہ وہ پانی کو اپنے پھیپھڑوں میں داخل کرلے اور یوں اپنے ہی ہاتھوں موت کے منہ میں چلا جائے۔ مگر اب مزید سانس روکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے سانس لی..... وہ بہت حیران بھی ہوا اور خوش بھی..... وہ سانس لے سکتا تھا۔ اس نے فوراً لمبی لمبی سانسیں کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھری۔ یہ دراصل پائپ کے چاروں طرف ایک چوکور سا خانہ تھا جو پانی کی سطح سے اوپر سرنگ کی چھت میں موجود تھا۔ کارل نے ذرا چہرہ نیچے کیا تو اس کا منہ پانی سے ٹکرایا۔ اس نے پائپ کے چاروں طرف گھوم پھر کر محسوس کیا کہ اس کے پاس صرف ایک فٹ کا خانہ ہے، جس میں موجود ہوا میں اسے کسی امکانی مدد کے آنے تک، بشرطیکہ کہ وہ آئی، سانس لینا ہوگا۔ سرنگ کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں وہ صرف چھونے کی حس سے کام کر رہا تھا۔

اس نے مضبوطی سے پائپ کو اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا تاکہ وہ پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ نہ بہہ سکے۔ لیکن پانی اتنا سرد تھا کہ اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ موت اس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے گرد پانی ساکن ہو گیا ہے۔ وہ خوش ہوا، ..... ''کیا وہ لوگ میری مدد کو آرہے ہیں!!!'' اس نے سوچا۔ پانی کے ساکن ہونے سے وہ خوش تو ہوا تھا مگر اسے یہ احساس نہیں تھا کہ بہتا ہوا پانی اپنے ساتھ تازہ ہوا بھی سرنگ میں لا رہا تھا، اور اب تازہ ہوا کی آمد بند ہو چکی تھی اسے اس محدود خانے کی محدود ہوا میں سانس لینا تھا..... بھلا اتنی سی ہوا اسے کب تک زندہ رکھ سکتی تھی۔ اسے ڈوبے ہوئے ایک گھنٹہ دس منٹ ہو چکے تھے۔ فائر بریگیڈ والوں نے ایک پمپ منگوا کر پانی کو تالاب سے خارج کرنا شروع کر دیا تھا، اسے بھی خوش قسمتی ہی کہئے کہ فائر بریگیڈ اسٹیشن کا یہ واحد پمپ آج ہی ساڑھے چار بجے سہ پہر مرمت کے بعد واپس آیا تھا۔

پانی کی سطح تیزی سے نیچی ہو رہی تھی لیکن روڈا نے محسوس کیا کہ وہ عمودی سرنگ سے سارے پانی کے خارج ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ اس نے کرونن کو ساتھ لیا اور ایک سیڑھی کی مدد سے سرنگ میں داخل ہو گیا۔ پانی اتنا نیچے آچکا تھا کہ افقی سرنگ کی چھت اور پانی کی سطح کے درمیان ایک یا دو انچ کا خلا پیدا ہو گیا تھا اور روڈا کمر کے بل تیرتے ہوئے سرنگ میں آگے جا سکتا تھا۔ جونہی یہ خلا کچھ اور بڑا ہوا تو روڈا نے محسوس کیا جیسے اس نے کوئی آواز سنی ہے۔ ''کیا بچہ زندہ ہے اور مدد کے لئے پکار رہا ہے'' اس نے سوچا۔

اس نے کرونن کو اوپر سرنگ کے منہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ باہر موجود لوگوں کو خاموش کرا سکے۔ مکمل خاموشی میں روڈرا نے پھر آواز سنی جو یقیناً کارل ہی کی تھی۔

"اوہ میرے خدا، بچہ زندہ ہے!!" وہ چلّایا۔ اس کی آواز سن کر کرونن بھی تیزی سے سیڑھی سے نیچے آیا اور پھر دونوں طاقتور لیمپوں کی روشنی میں کمر کے بل تیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ روڈا کی ناک سرنگ کی چھت سے ٹکرا کر چھل چکی تھی مگر وہ آگے بڑھتے رہے۔ کوئی دس فٹ آگے جا کر روڈا نے خود کو ایک کیبن نما جگہ پر پایا۔ وہ احتیاط سے گھُوما تو اس کی نظر خوف زدہ بچے کے سفید چہرے پر پڑی جو بُری طرح پائپ کے ساتھ چمٹا ہوا کپکپا رہا تھا اور ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" روڈا نے بے اختیار پوچھا اور فوراً ہی اپنے اس احمقانہ سوال پر ہنس دیا۔ "مجھے یہاں سے باہر نکالو۔" کارل چلّایا۔ "میں اپنی امی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" وہ مسلسل چیخ رہا تھا مگر پائپ کو چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ کرونن اور روڈا نے اسے تسلی دی اور بڑی مشکل سے پائپ کے گرد اس کی انگلیوں کی فولادی گرفت کو چھڑانے میں کامیاب ہو سکے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کارل کو لے کر سرنگ سے باہر آ چکے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی کارل کی ماں بے تابی سے چیخی۔

"میرا بچہ زندہ ہے، دیکھو انہوں نے اسے نکال لیا ہے۔"

کارل کو فوراً کمبلوں میں لپیٹ دیا گیا۔ اس کی ماں اس پر جھکی ہوئی آنسو بہا رہی تھی اور کارل اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ آٹھ بج کر ترپن منٹ ہو چکے تھے۔ کارل تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک پانی میں ڈوبا رہا تھا۔ اسے فوراً ایمبولینس کے ذریعے کوئن وکٹوریہ میڈیکل سینٹر پہنچایا گیا اور ہنگامی طبّی امداد دی گئی۔ جب لی ہوپکنز نے اس کی باتیں کرنے کی آواز سنی تو وہ دوڑ کر اپنے دوست کے پاس گیا اور اس سے لپٹ گیا۔ اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا "تم بہت خوش قسمت ہو دوست، نئی زندگی مبارک ہو۔"

اگلے دن جان روڈا واپس سٹی اسکوائر گیا اور سرنگ میں اتر کر اس نے دیکھا کہ سرنگ کی دیواروں پر کارل کے ناخنوں سے پڑی ہوئی خراشیں موجود ہیں۔ پائپ پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات بہت واضح نظر آ رہے تھے۔ حادثے کے وقت موجود لوگوں کی طرح جان روڈا بھی حیران تھا کہ بچہ کس طرح بچ گیا۔ اس نے سوچا "اگر لی ہوپکنز اور اس کی ماں کانسٹیبل کو فوراً واقعے کی اطلاع نہ دیتی، اگر سرنگ کے اندر وہ چھوٹا سا خانہ نہ ہوتا، اگر فائر بریگیڈ والوں کا پمپ خراب ہوتا اور فوراً نہ مل سکتا، تو کیا ہوتا۔ ان باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ حالانکہ وہ کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا لیکن کارل کا بچ جانا اس کے نزدیک کسی طرح بھی معجزے سے کم نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی ہستی ضرور ہے جو کسی نامعلوم مقام سے دنیا کے تمام معاملات کو کنٹرول کرتی ہے۔

اپنی دنیا

ساجد سعید

قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصے بعد کی بات ہے کہ ہمارے پڑوس میں کچھ لوگ رہنے کے لئے آئے۔ یہ سات آٹھ افراد پر مشتمل ایک مسلمان گھرانہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ کتے کا ایک پنجرہ بھی لائے تھے، جو انہوں نے گیراج میں رکھا ہوا تھا۔ مجھے شروع ہی سے جانوروں سے محبت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس کتے کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اکثر میں اپنے گھر کی دیوار پر چڑھ کر برابر والوں کے گیراج میں رکھے ہوئے کتے کے پنجرے کو دیکھنے کی ناکام کوشش کیا کرتی تھی۔ آخر ایک دن میں ان کے گھر گئی۔ تعارف اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے اس کتے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے

جرٹرڈ ہالینڈ ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے۔

پوچھا۔

"آپ نے اس کتے کو بند کیوں کر رکھا ہے؟ کتا تو حفاظت کے لئے رکھا جاتا ہے، اس کا تو کھلا رہنا ضروری ہے۔" میں نے دیکھا کہ میرے سوال پر ان کے چہرے کا رنگ کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ آخر کار ان کے گھر کا سربراہ آگے بڑھا اور پنجرے کا منہ کھول دیا۔ میں نے اندر جھانکا تو..... شاید میں آپ کو اس وقت کی کیفیات بیان نہیں کر سکتی کیونکہ اندر کتے کے بجائے ایک انسانی بچہ تھا جس کو ذہنی معذور ہونے کی وجہ سے اس پنجرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہی کوئی آٹھ دس سال کا ہو گا۔ اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کئی دنوں سے نہایا تک نہیں ہے۔ ہمدردی کے جذبے کے تحت میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے کچھ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رکھ دیا۔" یہ کہتے ہوئے چھہتر سالہ سسٹر جرٹ رُڈلیمنس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

یہ دنیا خوشیوں اور غموں کی دنیا ہے۔ احساس کی دنیا ہے جہاں ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا وغیرہ اس بات کی علامت ہے کہ ہم ان سب چیزوں کا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن اس بھری دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان تمام چیزوں کو کرنے کے باوجود احساس کے جذبے سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی اپنی ایک دنیا ہے۔ ذہنی اور جسمانی معذور لوگوں کی دنیا۔ ویسے تو پاکستان میں ذہنی اور جسمانی معذور بچوں کے لئے بہت سے ادارے سرگرم عمل ہیں لیکن ان میں ایک ادارہ "دارالسکون" ایسا بھی ہے جو ایک غیر ملکی خاتون سسٹر جرٹ رڈلیمنس بڑی تن دہی سے چلا رہی ہیں۔

آپ سینٹرل جیل سے سیدھا شہید ملت روڈ پر جانے کی بجائے اگر سیدھے ہاتھ نظر ڈالیں تو اونچے اونچے درختوں سے ڈھکی ایک خوب صورت سی سڑک نظر آئے گی۔ یہ کشمیر روڈ ہے۔ اپنے نام ہی کی طرح پر فضا اور راحت بخش۔ دارالسکون اسی پر سکون سڑک پر تھوڑا سا آگے جا کر کے ایم سی اسپورٹس کمپلکس کے نزدیک واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو خندہ پیشانی اور خوش دلی سے ہمیں خوش آمدید کہا گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سسٹر نے پوچھا،

"جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں گفتگو کر رہی تھیں۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور آنے کی وجہ بتلائی۔ اسی وقت ایک بچہ بڑی تیزی کے ساتھ گیند سے کھیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ کچھ بے معنی سی آوازیں نکال رہا تھا۔ شاید کسی بات پر ناراض تھا۔ سات آٹھ سال کا ہو گا۔ نیکر اور شرٹ پہنے ہوئے تھا چہرے سر اور جسم کے دوسرے ننگے حصوں پر جلنے کے بڑے بڑے گلابی مائل سفید نشانات نظر آ رہے تھے۔ شاید بچپن میں کسی حادثے میں جھلس گیا تھا۔ اسی جلنے کی وجہ سے اس کا چہرہ بڑا خوفناک سا ہو گیا ہے۔ خاص طور پر اس کی وحشت ناک آنکھیں۔ جب اس نے عجیب

معذور بچے اپنی مسیحا کے ساتھ

سے انداز میں ہماری طرف دیکھا تو ہم نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ سی محسوس کی۔ ہمیں کمرے میں موجود پاکر وہ خاموش ہو گیا تھا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے سسٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرا تو ہم غیر ارادی طور پر تھوڑا سا پیچھے سرک گئے۔ لیکن وہ بچہ سیدھا سسٹر کے پاس چلا گیا جو بڑے محبت بھرے لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھیں، "کیا ہوا میرے بیٹے کو؟" بچے نے پھر وہی بے ہنگم سی آوازیں نکالیں اور مسکراتے ہوئے سسٹر کی گود میں سر رکھ دیا۔ سسٹر بڑے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ ہم حیرت زدہ سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

دارالسکون کے قیام کے بارے میں بتاتے ہوئے سسٹر نے کہا، "میں ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران کراچی آئی تھی اس وقت میری عمر چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ان دنوں میرے ایک بھائی یہاں کراچی میں ایک چرچ میں پادری تھے۔ انہوں نے غریبوں اور معذور لوگوں کی امداد کے لئے ایک گروپ بنایا تھا۔ میں بھی اس گروپ میں شامل ہو گئی۔ ہم لوگ مختلف اسکولوں اور میٹرنٹی ہومز وغیرہ میں جاتے اور لوگوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے۔ میں لوگوں کو پریشان دیکھ کر بڑی تکلیف محسوس کرتی تھی۔ خاص طور پر اس وقت تو مجھے بہت ہی دکھ ہوتا جب میں معذور بچوں کو سڑکوں پر پھرتے دیکھا کرتی۔ شاید ان کے والدین انہیں بوجھ سمجھتے تھے جس کی وجہ سے ان کو اس طرح بے سہارا سڑکوں پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور وہ راہ چلتے لوگوں کے لئے تفریح کا سامان بن جاتے۔ ان کو دیکھ کر اکثر میرے دل میں

خیال پیدا ہوتا کہ ان لوگوں کے لئے کوئی ادارہ ہونا چاہئے جہاں یہ لوگ آرام، سکون اور عزت سے زندگی بسر کر سکیں اور پھر وہ واقعہ پیش آیا جس نے خود مجھے آگے بڑھ کر ایسا ادارہ قائم کرنے پر ابھارا۔ اس طرح ۱۹۶۹ء میں ہالینڈ کی حکومت کے تعاون سے میں دارالسکون قائم کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ میرے ادارے کا پہلا بچہ وہی تھا جو ہمارے پڑوس میں کتے کے ایک پنجرے میں قید زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بعد ہم نے سڑکوں پر پھرنے والے لاوارث بچوں کو بھی اس ادارے میں پناہ دی۔ اس وقت ہمارے پاس ۱۴۵ بچے زیر تربیت ہیں۔ ان میں سے صرف تین کے والدین ایسے ہیں جو باقاعدگی سے ان سے ملاقات کرنے یہاں آتے ہیں۔ باقی بچوں کو سماجی تنظیموں اور جیلوں سے لایا گیا ہے۔ مجھے ایک سیمینار میں جیل آنے کی دعوت دی گئی تھی اس جیل سے میں ۱۹ بچے لے کر آئی۔ ان بچوں کے سرپرستوں کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں۔ بعض نامعلوم حضرات تو ہمارے ادارے کے گیٹ پر بچوں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

ادارے کی مزید شاخوں کے بارے میں بتاتے ہوئے سسٹر نے کہا۔

"ہمارے ادارے کی کراچی میں چھ شاخیں ہیں جن میں دارالسکون کے علاوہ "لینمس ہوم" پولیو کے بچوں کے لئے، "جین ولی" لاوارث بچوں کے لئے، "نرسنگ ہوم" بیمار بچوں کی دیکھ بھال کے لئے اور "پیس ہیون" نوجوانوں اور معمر لوگوں کے لئے۔ اس کے علاوہ لاہور میں ہماری ایک شاخ ہے جس میں ۶۰ بچے زیر تربیت ہیں۔

"ہمارے ہاں یہی کوشش کی جاتی ہے کہ پیار اور محبت کے ذریعے ان کے احساس محرومی کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ ان کی کسی بھی غلطی پر انہیں مارا یا ڈانٹا نہیں جاتا کیونکہ یہ بچے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایسے بچوں کو اگر کوئی بات سمجھائی جاتی ہے تو وہ اس کو جلد ہی سیکھ جاتے ہیں، جیسے کھانے کے بعد ہاتھ دھونا، کسی چیز کو اٹھانے کے بعد اس کی مقررہ جگہ پر رکھنا وغیرہ۔ یہاں روزانہ دو وقت ان بچوں کے لباس تبدیل کروائے جاتے ہیں۔ میوزک اور کھیلوں سے ان کو خوش رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے بھی ان کا دل بہلایا جاتا ہے۔"

کمرے میں داخل ہونے والا پہلا بچہ ہماری گفتگو کے دوران ہی باہر جا چکا تھا اور اب ایک اور بچی وہاں آ گئی تھی۔ ننھی سی..... چار پانچ سال کی۔ پتلی سی گردن پر بہت بڑا سا سر اور سر کے اوپر دو بڑے بڑے گومڑ۔ جیسے گوشت کے سینگ ہوں۔ سپاٹ چہرہ، زبردستی کھلی ہوئی چینیوں جیسی چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔ جو عام انسانی آنکھوں کے درمیانی فاصلے سے ذرا زیادہ فاصلے پر واقع تھیں۔ ناک کے نتھنے اوپر کو کھلے ہوئے، چہرے کی مجموعی بناوٹ ایسی تھی کہ دیکھتے ہی کراہت کا احساس ہوتا

خوشی کے لمحات ہماری زندگی میں بھی آتے ہیں۔

تھا۔ کوشش کے باوجود بھی ہم اسے گود میں بٹھا کر پیار کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور دور ہی دور سے اخلاقاً مسکرا کر اس کا حال پوچھا۔ یہ کُوکی تھی۔ سسٹر کی سب سے زیادہ لاڈلی بچی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سسٹر تڑپ کر کرسی سے اٹھیں اور بے پناہ محبت سے اسے گود میں اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ ہم رشک کی نگاہوں سے ان دو پیار کرنے والی ہستیوں کو دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا گیا ہو۔ سسٹر جرٹ رُڈ نے ہمیں بتایا کہ یہاں پر موجود عملے کے لوگ ہالینڈ سے اپنے خرچ پر یہاں آتے ہیں اور مہینہ یا سال بھر یہاں کام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہیں موجود ایک نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا،

"یہ نوجوان بھی ہالینڈ سے یہاں دو سال کے لئے آیا ہے۔" ہم نے کرسی سے اٹھ کر انسانیت کے اس خادم سے ہاتھ ملایا اور اس قابلِ فخر خدمت پر اس کی تعریف کی۔

سسٹر نے ہمیں اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"ہالینڈ میں میرے والد صاحب بینک منیجر تھے۔ میں نے اچھی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد نرسنگ ہوم میں داخلہ لیا اور پھر سماجی خدمت کے شعبے میں شمولیت اختیار کر لی۔ میرے آٹھ بیٹے ہالینڈ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے صدر پاکستان غلام اسحاق خان نے مجھے اس خدمت کے صلے میں گولڈ میڈل سے نوازا جس پر میں ان کی نہایت شکر گزار ہوں۔

آنکھ مچولی کے قارئین کے نام اپنے پیغام میں سسٹر نے کہا۔

"میں ایسے بچوں کو جو کہ صحت مند اور نارمل ہیں یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے آپ کو اچھا ذہن اور جسم عطا کیا ہے اور آپ کو ایسے بچوں کی طرح نہیں بنایا جو دماغی اور جسمانی معذور ہیں اور بڑی مشکل سے زندگی گزار رہے ہیں اور زندگی کا صحیح لطف بھی نہیں اٹھا سکتے۔ آپ کو ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہیں۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ جب آپ ایسے بچوں کو دیکھیں جو کہ جسمانی یا ذہنی معذور ہیں تو ان سے نفرت کا اظہار نہ کریں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ محبت کریں۔ جس طرح آپ کے صحت مند اور نارمل ہونے میں آپ کا کوئی کمال نہیں اسی طرح ان کے معذور ہونے میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ صحت مند ہونے کی وجہ سے زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں اور وہ خدا کی طرف سے دی گئی آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ معذوروں سے محبت اور پیار سے پیش آئیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ ان میں احساس محرومی پیدا نہ ہو اور وہ معاشرے پر بوجھ نہ بن جائیں۔"

سسٹر جرٹ رڈ کے ہمراہ ہم نے دارالسکون کے پُرعزم عملے اور زیر تربیت بچوں سے بھی ملاقات کی۔ اس چھوٹی سی دنیا میں چھوٹی بڑی عمروں کے بچے اور بچیاں رہائش پذیر ہیں اور سسٹر کی محبت کے چھتنار درخت تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ کافی دیر بعد ہم نے ان سے اجازت لی اور دارالسکون سے باہر نکل آئے۔

تمام راستے ہم اس بات پر رشک کرتے رہے کہ اس مطلب پرست دنیا میں ایسے بے لوث لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ جس میں زبان، مذہب اور علاقے کی کوئی تفریق نہیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اگر ہر شخص سسٹر جرٹ رڈ کا جذبہ اپنا لے تو اپنی دنیا بھی دارالسکون بن جائے۔

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں
پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں
انھیں نہ ماریئے
انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

آنکھ مچولی البم

بے خوف کوئی ہم سا نہ مانے میں نہ ہوگا

ڈاکیا

جاوید عبدالکریم سحر

پہنے ہوئے یہ آدمی خالی لباس ہے
لگتا ہے نوکری یہ بہت اس کو راس ہے
تنہا نہیں ہے بائیسکل بھی اس کے پاس ہے
تب ہی تو اتنا خوش نظر آتا ہے ڈاکیا
نامے بہت ہی دور سے لاتا ہے ڈاکیا
گھر گھر خطوط بانٹنے جاتا ہے ڈاکیا
کچھ ہاتھ میں خطوط ہیں تھیلے میں کچھ پڑے
سادے ہیں کچھ لفافے تو کچھ چھوٹے اور بڑے
عادت نہیں ہے اس کی کسی سے کہیں لڑے
سب کو رفیق اپنا بناتا ہے ڈاکیا
نامے بہت ہی دور سے لاتا ہے ڈاکیا
گھر گھر خطوط بانٹنے جاتا ہے ڈاکیا
خط بانٹنے میں ڈاکیا رکھتا ہے یہ خیال
بھولے سے بھی ہو چوک نہیں اس کا کچھ سوال
خط بھول میں کس کا غلط گھر میں دے نہ ڈال
جس کا ہے خط اسی کو تھماتا ہے ڈاکیا
نامے بہت ہی دور سے لاتا ہے ڈاکیا
گھر گھر خطوط بانٹنے جاتا ہے ڈاکیا
گرمی کی تیز دھوپ ہو، آندھی ہو یا ہوا
موسم کا حال کچھ بھی ہو اچھا ہو یا بُرا
جاڑے کا ہو مہینہ کہ ساون کی ہو گھٹا
خط سب کو بانٹتا نظر آتا ہے ڈاکیا
نامے بہت دور ہی سے لاتا ہے ڈاکیا
گھر گھر خطوط بانٹنے جاتا ہے ڈاکیا

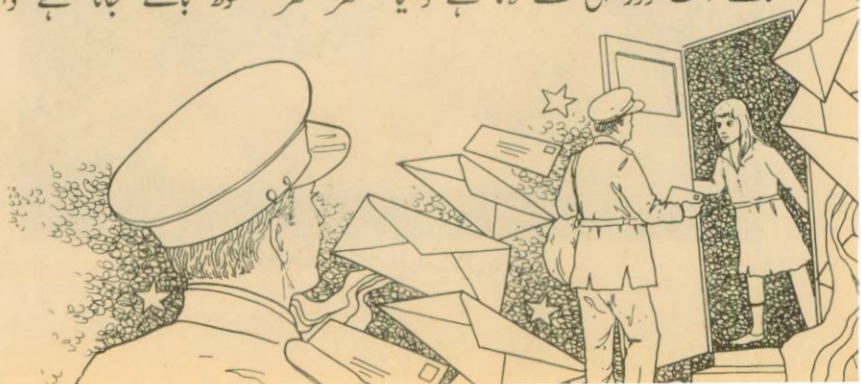

تتلی کا پر

میرزا ادیب

اس روز پروفیسر رحمت علی کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے اپنے کنبے کے تو صرف تین افراد تھے۔ ایک وہ خود پھر ان کی بیگم اور گھر کا تیسرا فرد تھا ان کی اکلوتی بیٹی فردوس۔ ان سے بھلا گھر میں کیا چہل پہل ہو سکتی ہے؟ اس لئے یہاں عام طور پر اداسی ہی رہتی تھی البتہ کہیں سے مہمان آجاتے تھے تو چند گھنٹوں کے لئے اداسی دور ہو جاتی تھی اور اس دن جو صبح سے ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ہنگامہ برپا تھا تو یہ اس وجہ سے تھا کہ ان کی چھوٹی بہن اپنے چھ بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ یہ بہن تو ڈاکٹر صاحب کی بیگم سے باتیں کر رہی تھی اور سارے بچے کوٹھی کے اندر خوبصورت باغ میں کھیلتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔

فردوس یونیورسٹی میں لیکچرار تھی، یونیورسٹی سے واپس آکر وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی۔ اسے مطالعے کا بڑا شوق تھا اپنے کمرے میں اسے مطالعے کی پوری پوری سہولت حاصل تھی مگر گھر میں مہمان بچے آتے تھے اور وہ شور مچاتے تو بُرا نہیں مانتی تھی بلکہ بچوں کو خوش دیکھ کر خود بھی

خوش ہو جاتی تھی۔

باغیچہ اس کے کمرے کے سامنے واقع تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ بچوں کے شور و غُل میں دھیان سے مطالعہ نہیں کر سکتی اس لئے کتاب ایک طرف رکھ کر وہ کرسی پر کھڑکی کے سامنے بیٹھ گئی تھی اور بچوں کو طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف دیکھ کر لطف اٹھا رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ رات اپنی سہیلی سے باتیں کرتے ہوئے وہ اپنا پرس ڈرائنگ روم میں بھول آئی تھی۔

پرس کا خیال آیا تو وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کو جانے لگی۔

پرس وہاں نہیں تھا جہاں اس نے رکھا تھا ادھر ادھر صوفوں پر نظر ڈالنے کے بعد اسے اپنا پرس تپائی پر دکھائی دیا۔ وہ تپائی کی طرف بڑھی اور پرس اٹھا کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی نظر بچوں پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ سب کے سب جھک کر ایک پودے کے نیچے کسی چیز کی تلاش میں لگے ہیں۔

"یہاں کیا چیز پڑی ہے جسے ڈھونڈ رہے ہیں، شاید گیند ہوگی، لیکن گیند سے تو یہ کھیل ہی نہیں رہے تھے پھر یہ کیا شے ہے؟

"کیا ہے افشاں؟" اس نے بچوں کی بڑی بہن کو مخاطب کر کے کہا۔

افشاں نے آواز سن لی تھی اور اس نے جواب بھی دیا تھا جو فردوس سن نہیں سکی تھی۔

فردوس نے دوبارہ پوچھنے کی بجائے یہ بہتر سمجھا کہ خود باغ میں جا کر اصل حقیقت معلوم کرے۔ چنانچہ وہ اپنے کمرے سے باہر آ کر باغ کی طرف جانے لگی۔

بچوں نے اسے آتے دیکھا تو ایک طرف ہٹ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو بچو!"

"یہ جی" افشاں نے ایک ننھی سی رنگین شے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھائی۔

"باجی! تتلی کو پکڑ لیا تھا پر نکل گئی۔" افشاں نے بتایا۔

"اور یہ کیا ہے؟" فردوس نے پوچھا۔

"اس کا پر ہے خود نہ جانے پودے میں کہاں گم ہو گئی ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ فردوس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا فوراً آگے بڑھ کر افشاں کے شانے کو اس زور سے دبایا کہ افشاں کی چیخ نکل گئی۔

"ذرا دبایا ہے تو چیخ اٹھی ہو..... اس معصوم کو اَدھ مُوا کر دیا اور گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ شرم نہیں آئی بے چاری تتلی کو معذور کرتے ہوئے، اب اڑے گی کیسے.....؟ بتاؤ اب کیسے اڑے گی؟"

فردوس کا ایک تو چہرہ غصے سے ڈراؤنا ہو گیا تھا اس پر اس نے یہ لفظ بڑے تلخ لہجے میں کہے تھے سارے بچے ڈر کر کچھ پیچھے ہٹ گئے تھے اور افشاں کے منہ سے تو بات ہی نہیں نکلتی تھی۔

افشاں کو ڈر سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی کہ فردوس

نے ہمیشہ اس سے بڑا پیار کیا تھا اسے ہر سالگرہ پر خوبصورت اور قیمتی تحفے دیئے تھے وہ حیران پریشان کھڑی تھی۔

"اندر جاؤ..... تم اس قابل نہیں ہو کہ یہاں کھیلو..... کتنا ظلم کیا ہے تم نے تتلی پر۔"

یہ کہہ کر فردوس گھومی اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ کرسی پر جا بیٹھی مگر جلد ہی اٹھ گئی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گئی۔ کھڑکی کے سامنے پہنچی بچے ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے سرگوشیاں سی کر رہے ہوں۔ افشاں پودے کی ایک ٹہنی کو اپنے ایک ہاتھ میں تھامے بیٹھی تھی اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

فردوس کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ کرسی کی طرف آئی اور اپنے ہاتھ اس کی پشت پر رکھ کر کچھ سوچنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے افشاں سے سخت الفاظ کہہ دیئے ہیں یا وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے جو کچھ کیا ہے درست کیا ہے۔

دو تین منٹ گزر گئے تھے فردوس اسی حالت میں کھڑی تھی۔

"باجی جی!"

آواز سن کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ افشاں کھڑی تھی۔

"باجی! میں آجاؤں؟"

اس نے سر کے اشارے سے افشاں کو اندر آنے کی اجازت دی۔

افشاں دھیرے دھیرے اس کے پاس آکر رک گئی۔

"باجی! میں....."

افشاں نے اپنا فقرہ مکمل نہ کیا اور فردوس نے اپنے سر کو اس انداز سے جنبش دی جیسے کہنا چاہتی ہو میں جانتی ہوں تمہارے دل میں کیا ہے۔ فردوس نے افشاں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے صوفے کی طرف لے چلی۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر پاس پاس بیٹھ گئیں۔

"باجی! میں شرمندہ ہوں اپنی حرکت پر..... میں جانتی ہوں آپ کو دکھ ہوا ہے۔ آپ تو بہت ہی اچھی باجی ہیں کبھی غصہ نہیں کیا۔"

افشاں کا ہاتھ ابھی تک فردوس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ دبانے لگی تھی۔

"مجھے دکھ ہوا تھا سخت لفظ کہہ دیئے۔" فردوس بولی۔

"معاف کر دیجئے نا باجی!"

فردوس نے افشاں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے ہاتھ سے اس کا شانہ تھپتھپانے لگی۔

"باجی! شاید کوئی بات ہے اگر آپ یہ بات بتا دیں تو باجی! میں بہت ممنون ہوں گی۔"

"یقیناً ایک بات ہے۔"

افشاں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ اٹھی کھڑکی کے قریب دیوار میں جو الماری تھی اس کا ایک پٹ کھولا اور اس میں سے ایک کتاب لے کر واپس

اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

"یہ دیکھو۔" فردوس نے کتاب کھولی ایک صفحے پر تتلی کا ایک سفید پر لگا ہوا تھا۔

"دیکھ رہی ہو؟"

"جی باجی۔"

فردوس دو تین لمحے خاموش رہی کتاب بند کر کے صوفے کے بازو پر رکھ کر کہنے لگی۔

"میں جب تمہاری عمر کی تھی تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ تتلیوں کے پیچھے بھاگا کرتی تھی۔ بڑی کوشش کے باوجود کوئی تتلی میرے ہاتھ نہیں آتی تھی میری ناکامی پر میری سہیلیاں ہنس دیا کرتی تھیں....."

ایک مرتبہ میں نے ایک پھول پر ایک بالکل سفید تتلی دیکھی ارادہ کرلیا کہ اسے پکڑ کر ہی چھوڑوں گی۔ اس وقت میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھتی گئی..... یہاں تک کہ پھول کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑلیا۔ وہ تڑپی۔ اس کا پر میرے ہاتھ میں رہا اور وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

مجھے اپنی ناکامی پر افسوس ہوا لیکن میں نے اس کا پر تو اپنے قبضے میں کر ہی لیا تھا۔ یہ پر میں مٹھی میں بند کر کے اپنے کمرے میں لے آئی اور اسے کتاب میں رکھ دیا۔

فردوس سلسلہ کلام جاری رکھ کر کہنے لگی،

"دسویں جماعت کا نتیجہ نکلا تو میں نے بڑے اعزاز کے ساتھ امتحان پاس کرلیا مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ پھولی نہیں سماتی تھی اس حالت میں سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی تو نہ جانے کس طرح دوسری تیسری سیڑھی پر ہی پاؤں پھسل گیا اور میں دھڑام سے آخری سیڑھی کے نیچے گر پڑی۔ دھماکے کی آواز سن کر ابا، امی بھاگے بھاگے آئے۔

چوٹوں کی وجہ سے میں بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر آیا اس نے مناسب کارروائی کی، ہوش آنے کے بعد درد کے مارے میرا بُرا حال تھا جگہ جگہ چوٹ آئی تھی۔ سب سے زیادہ درد میرے شانے میں ہو رہا تھا جو بُری طرح زخمی ہوگیا تھا۔

اعزاز پانے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی اب میں تھی اور رات دن پلنگ۔ چلنا پھرنا موقوف..... ہر وقت لیٹی رہتی تھی۔

دن گزرتے گئے اور میری حالت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی اس دوران میں ہر روز عزیز، رشتہ دار، میری سہیلیاں میری تیمار داری کرتی رہیں میں ان سب چہروں کو اچھی طرح پہچانتی تھی مگر کبھی کبھی ایک ایسا چہرہ بھی دکھائی دے جاتا تھا جسے میں نہیں پہچان سکتی تھی۔ لگتا تھا اسے میں نے پہلے یا تو کبھی دیکھا ہی نہیں ہے اور دیکھا بھی ہے تو بھول گئی ہوں۔

یہ ایک لڑکی تھی عمر میں مجھ سے چھوٹی۔ سفید براق لباس پہنے ہوئے۔ اس وقت آتی تھی جب میرے پاس کوئی اور تیمار دار نہیں ہوتا تھا۔

بڑی خوش دلی سے مجھے دودھ پلاتی رہتی سیب کاٹ کر دیتی تھی۔ دوا کے وقت دوا پلاتی تھی۔

میں نے کئی بار چاہا کہ اس سے پوچھوں "آپ کا نام کیا ہے؟"

مگر یہ سوچ کر نہ پوچھ سکی کہ کہے گی ہر روز آتی ہوں اور یہ میرا نام ہی نہیں جانتی۔

ایک شام میرے شانے میں بڑا درد محسوس ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں یکایک قریب سے اس لڑکی کی میٹھی سی آواز آئی۔

"سو رہی ہیں آپ؟"

"نہیں..... شانے میں بڑا درد ہے۔"

"اوہو..... شانے کا درد ہوتا ہی بڑا سخت ہے۔"

اس کی آواز میں ایسا درد بھرا تھا کہ میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور....."

فردوس خاموش ہو گئی..... افشاں جو بڑی توجہ سے اس کے الفاظ سن رہی تھی بولی

"اور..... باجی؟"

فردوس کے ہونٹ حرکت میں آ گئے۔

"میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کا پورا بازو غائب ہے۔ یک لخت مجھے اس تتلی کا خیال آ گیا جس کا ایک پر میں نے نوچ ڈالا تھا میں نے سوچا یہ وہی تتلی ہو گی۔"

"اوہ میرے اللہ۔" افشاں کے منہ سے نکلا۔

فردوس نے آنکھیں بند کر لیں اور جب کھولیں تو اس کی پلکیں بھیگی ہوئی لگتی تھیں۔

"اس وقت اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا وہ نظریں میں آج تک نہیں بھول سکی اور نہ کبھی بھول سکوں گی" فردوس نے گلو گیر آواز میں کہا۔

افشاں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔

.....○.....

متوازن غذا

صحت کی ضامن

ماہرین غذائیت، غذاؤں کو درج ذیل چار حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت، انڈے، مرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصّوں سے کچھ نہ کچھ کھا لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھا لی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آ گئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظان صحت و تندرستی اطفال - آنکھ مچولی

آصف فرخی

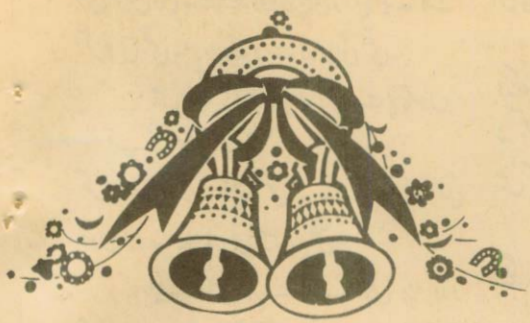

چیزوں کی کہانی

جہاں جہاں گھنٹی خود نہیں جاسکتی، وہاں اس کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ گھنٹی کی آواز میں ایک آہنگ ہوتا ہے، جو بڑا شیریں ہوتا ہے اور سننے والوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن گھنٹی موسیقی کا ساز نہیں ہے وہ بجتی ہے تو اس کے بجنے میں کوئی نہ کوئی خبر ہے، اور اس کی آواز میں بلاوا ہے۔ گھنٹی وقت گزرنے کی اطلاع دیتی ہے، مدت پوری ہو جانے پر خبردار کرتی ہے، اور کہیں کہیں عبادت کے لئے بلاتی ہے۔ ٹیلی فون میں یا دروازے پر بج اٹھتی ہے تو کسی ملاقاتی کی خبر لاتی ہے۔ بعض جگہوں پر گھنٹی خطرے کی اطلاع دیتی ہے، اور آگ یا طوفان سے بچاؤ کے لئے خبردار کرتی ہے، مدد مانگتی ہے۔ اونٹوں اور گائے بھینسوں کے گلے میں بندھی ہوتی ہے، اور دن بھر چرنے کے بعد جانور شام پڑے اپنے گھر لوٹتے ہیں تو ان کے گلے میں بندھے بندھے بجتی ہے کہ جانور بھٹک جائیں تو گلے بان کو پتہ چل جائے کہ وہ کہاں ہیں اس طرح گھنٹی ان کی خبر رکھتی ہے، اور جن کی خبر رکھی جائے وہ جانور حفاظت سے رہتے ہیں۔

گھنٹی کی آواز کہاں کہاں جاتی ہے اور کیا کیا کام کرتی ہے!

ابتدائی دور کے انسان نے گھنٹی نہیں بنائی۔ اسے گھنٹی کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ خبردار کرنے اور اطلاع دینے کا کام لوگ خود ہی پورا کر لیتے تھے جب انسان نے غاروں سے نکل کر بستیوں میں رہنا شروع کیا، اور الگ الگ بستیوں میں رہنے والے لوگوں میں اختلاف کی صورت پیدا ہوئی، تو بستی والوں کو کسی بھی نئے آدمی کے بستی کی طرف آنے کی پہلے سے اطلاع ملنا ضروری ہو گیا، اور یوں گھنٹی کی ضرورت پڑی۔ شہروں اور قصبوں میں قلعے کے اونچے برج پر ایک آدمی کو بٹھا دیا جاتا جو آنے والوں کو دور سے دیکھ لیتا اور وہیں سے نعرہ لگا کر بستی والوں کو خبردار کر دیتا یوں بستی حملہ آوروں اور لٹیروں سے

نمٹنے کے لئے تیار ہو جاتی۔ پھر برج پر، یا اونچے میناروں پر گھنٹیاں لگائی جانے لگیں تاکہ کسی بھی اہم خبر کے لئے بستی والوں کو جمع کیا جاسکے۔

تاریخ کے صفحات میں کئی قدیم معاشروں میں گھنٹیوں کا ذکر ملتا ہے کہ گھنٹیاں لوگوں کی توجہ مبذول کرنے کے لئے یا کوئی اہم خبر سنانے کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ گھنٹی کا ذکر انجیل میں بھی آیا ہے۔ قدیم آشوریہ اور بابل میں سونے کی گھنٹیاں، گھوڑوں کے گلے میں باندھی جاتی تھیں، اور ان گھنٹیوں کی آواز کا مطلب یہ تھا کہ شاہی رتھ آرہا ہے۔ یہ آواز سن کر لوگ راستہ چھوڑ دیتے اور مؤدب ہو جاتے۔ قدیم یونان میں قصبوں اور محلوں کی حفاظت کے لئے چوکیدار موجود ہوتے، اور ایک چوکیدار سے دوسرے چوکیدار تک ایک گھنٹی گردش کرتی رہتی۔ ہر چوکیدار یہ گھنٹی اگلے تک پہنچا کر یہ ظاہر کرتا کہ وہ جاگ رہا ہے اور ہوشیار ہے۔ روم میں قاصد اور نقیب لڑکے گھنٹی بجا کر شہریوں کو کسی اہم اجلاس کے لئے یا حمام کے کھلنے کی خبر دینے کے لئے جمع کرتے۔

کئی معاشروں میں گھنٹی کی آواز کا تعلق عبادت سے بھی رہا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یوروپ میں گرجا گھروں میں گھنٹیاں رواج پانے لگیں۔ گھنٹی بجا کر لوگوں کو عبادت کے لئے بلایا جاتا تھا۔ پھر ان گھنٹیوں سے شہری زندگی کے بعض اور اہم کام بھی کئے جانے لگے۔ گھنٹیاں بجا کر صبح، دوپہر اور شام کا وقت بتایا جاتا، آگ لگنے کی اطلاع دی جاتی، رات کو سونے اور صبح کو اٹھنے کے لئے خبردار کیا جاتا۔ گھنٹی بجا کر لوگوں کو ہوشیار ہونے اور ہتھیار اٹھالینے کے احکام دیئے جاتے اور گھنٹی کی آواز کے ذریعے کسی آنے والے خطرے یا اہم واقعے کی اطلاع دور دور تک پھیل جاتی۔

بعض علاقوں میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ گھنٹی کی آواز سے طوفانوں اور آنے والے خطروں کو دور بھگایا جاسکتا ہے، اور بُرا اثر ڈالنے والی بدروحوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

مغل بادشاہوں کے عہد میں صبح اور شام کے وقت کا اعلان گھنٹی سے وابستہ نہیں تھا۔ دلی کے لال قلعے میں توپ دغنے سے اعلان ہوتا۔ رمضان میں سحری و افطار کے وقت کا اور عید کا چاند نظر آنے کا اعلان توپ کی آواز سے ہوتا اب یہ اعلان سائرن کی آواز سے ہوتا ہے جو برقی گھنٹی کی ایک شکل ہے۔

گھنٹی کا ایک انوکھا استعمال شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ہوا۔ جہانگیر نے اپنے محل میں مشہور و معروف زنجیر عدل بنوائی ہوئی تھی۔ جس کسی کو شہنشاہ کے سامنے فریاد کرنا ہوتی، یا عدل و انصاف طلب کرنا ہوتا وہ زنجیر کھینچتا۔ یہ زنجیر ایک گھنٹی سے جڑی ہوتی تھی، جو زنجیر کھینچنے پر فریاد کو شہنشاہ تک لے جاتی اور شہنشاہ کو خبر ہو جاتی کہ کوئی فریادی آیا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، گھنٹی کا استعمال بڑھتا گیا اور مختلف نوعیت کے کاموں کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا جانے لگا۔ انگلستان اور امریکا میں

گھنٹی کے ذریعے ملازم کو بلایا جاتا۔ گھنٹی کی آواز سن کر بچے اسکول جاتے اور یہی آواز سن کر اسکول سے چھٹی کرتے۔ اسکول اور گھنٹی کا یہ ساتھ آج تک قائم ہے۔ سودا بیچنے والے اور اشتہار بانٹنے والے اپنی جانب توجہ مبذول کرانے کے لئے گھنٹی بجانے لگے۔ یہ رواج آج بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ جاڑے کی شاموں میں، کراچی کے بعض محلوں میں بھنتی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں بیچنے والے گھنٹی بجا کر گھروں میں دبکے ہوئے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مونگ پھلی کا ٹھیلا آرہا ہے۔ گھنٹی کی آواز کا مقصد خریدنے والوں کو خبر کرنا ہوتا ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ آواز سودے کے ذائقے میں شامل ہوگئی ہے اور گھنٹی کی آواز نہ ہو تو مونگ پھلیوں کا لطف آدھا رہ جائے۔

ٹیلیفون کی گھنٹی اور دروازوں پر لگی ہوئی اطلاعی گھنٹی آج تک لوگوں کو بلانے اور اطلاع دینے کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

SOHRAB VIP sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

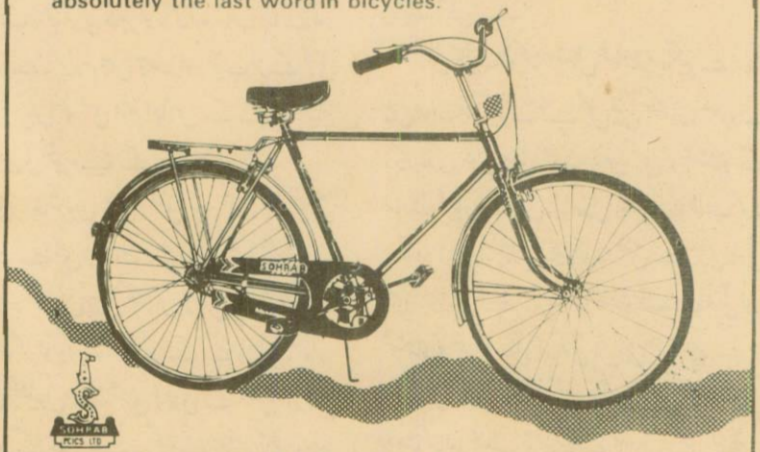

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan.

Midas

ٹکٹ

عبدالغفار

رجسٹری پر دستخط کروانے کے بعد بھی ڈاکیا صاحب بدستور کھڑے مسکراتے رہے۔ ہم نے حیرت سے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا "وہ جی کچھ انعام تو دیں۔" "انعام..... کیوں؟" ہم مزید حیران ہوئے۔ "بھائی جان کا ٹکٹ جو آیا ہے باہر سے۔" اب ان حضرات کے دانت نکل رہے تھے۔

ہم اپنی جگہ خود حیران بلکہ پریشان تھے۔ ایک تو اس بات پر کہ بھائی کا ٹکٹ بھیجا کس نے؟ اور اگر اس رجسٹرڈ لفافے میں واقعی ٹکٹ ہے تو ڈاکیے کو کیسے پتہ چلا۔ ہم نے اسے قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اس بند لفافے میں ٹکٹ ہے؟ کھولا تھا تم نے اسے؟"

"ہم تو لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ اور جی دوسرے ملک سے کوئی یونہی رجسٹری نہیں بھیجتا۔" موصوف نے اپنی ذہانت بگھارتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے اگر اس میں میرے بھائی کے لئے ٹکٹ آیا ہے تو پھر انعام بھی اسی سے لینا، ہمارے لئے ٹکٹ آتا تو ہم انعام دیتے۔ ہم نے اپنے طور پر معقول بات کہی۔ ڈاکیا صاحب مسکراتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے جی اب آپ کا کوئی رسالہ آیا تو میں انعام لیئے بغیر نہیں دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے تیزی سے سائیکل پر سوار ہوئے اور گھنٹی بجاتے ہوئے ہوا

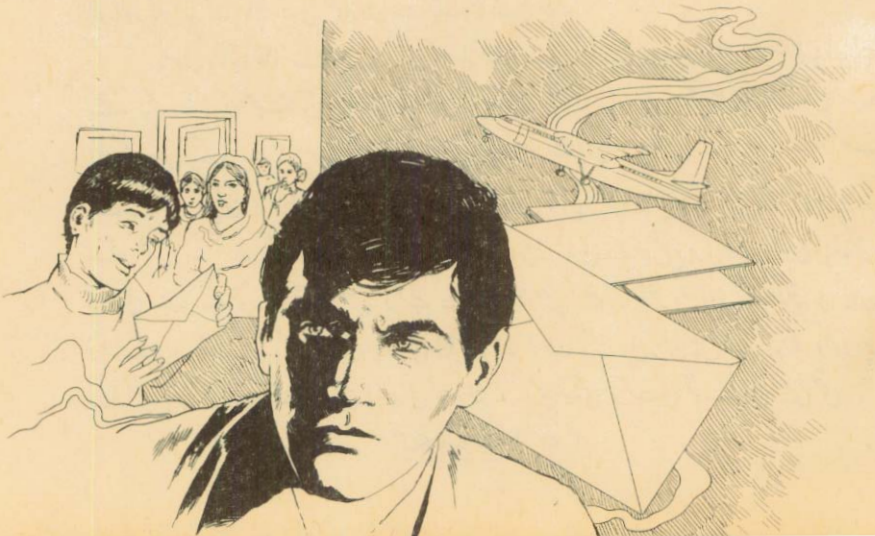

ہوگئے۔ ہم لفافے کو الٹتے پلٹتے اندر چلے آئے۔ بھیجنے والے کا نام بالکل اجنبی تھا۔ کمرے میں امی جان کے پاس ایک رشتہ دار خاتون آئی بیٹھی تھیں۔ ہم نے خط میز پر رکھتے ہوئے کہا! "عامر کو اس کے کسی دوست نے باہر سے ٹکٹ بھیجا ہے۔"

سب بیک وقت حیرانی سے چیخے!!! ہیں!!! "ٹکٹ..... باہر سے۔ تو اب تمہارے بھی دن پھر گئے ہیں۔" رشتے دار خاتون نے کچھ خوش ہوتے ہوئے اور زیادہ جلتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں تو عامر سے کہوں گی کہ جاتے ہی پہلے وی سی آر اور رنگین ٹیلی ویژن بھیجے۔" دیبا نے خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے سے کہا۔ وہ سہیلیوں کے گھر وی سی آر پر فلمیں دیکھ دیکھ کر تنگ آگئی تھی۔

"نہ بھائی! سب سے پہلے تو باورچی خانے کے لئے مشینیں آئیں گی۔ سل بٹے سے مصالحہ پیس پیس کر میرے تو ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔" امی نے اپنی رائے دی۔

"پتہ نہیں لفافے میں ٹکٹ ہے بھی یا نہیں۔" ہم نے سب کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

ہمارے اس طرح ہنسنے پر دیبا جل کر بوڑھی عورتوں کے انداز میں بولی "اے تیرے منہ میں خاک، اول فول نہ بکا کر نگوڑی۔" شام سے پہلے پہلے پورے محلے اور آدھے رشتہ داروں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ عامر کو سعودی عرب میں بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے اور وہ کل پرسوں میں چلا جائے گا۔ عامر ہمارا بھائی، شام کو آفس سے آتا ہے! اس کے آنے سے پہلے رجسٹری کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سب بے چین ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے اور بھئی گھر والوں سے زیادہ بے چینی کا شکار باہر والے تھے۔ وقفہ وقفہ سے گھنٹی بجتی یا پھر کوئی بجانے کی زحمت ہی گوارہ نہ کرتا۔ دروازہ کھول کر سیدھا اندر، اور پھر مبارک سلامت کی آوازوں سے ایک ہنگامہ مچ جاتا۔

ماموں، تایا، خالو سب ڈیڈی اور امی کو مبارکباد دینے، اپنے بیوی بچوں سمیت تشریف لا رہے تھے۔ کچھ نے زیادہ محبت جتائی تو مٹھائی کے ڈبے بھی ساتھ لیتے آئے۔ بس گلے میں ہار ڈالنے کی کسر رہ گئی تھی جس کے بارے میں سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ایئرپورٹ پر جاکر پہنائیں گے۔ ہر آنے والا سب سے پہلے ٹکٹ دیکھنے کا مطالبہ کرتا۔ اس بند لفافے کا سب کو دیدار کرانے کی ذمہ داری ہم نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ ٹکٹ دیکھنے والوں کو ہم لفافہ یوں دکھاتے جیسے شادی کے موقع پر بری کے جوڑوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ تو ہماری اس حرکت سے سخت ناراض تھے کہ آخر ہم دور سے لفافہ ہی کیوں دکھاتے ہیں۔ لفافہ کھول کر ٹکٹ کیوں نہیں نکال لیتے۔ مختلف لوگ دبی زبان میں ہم پر اور گھر والوں پر ریمارکس پاس کر رہے تھے۔ "توبہ! اتنا بھی کیا اترانا" "ایسی اوچھی حرکت کی تم سے توقع نہیں تھی۔"

"کیا مصیبت ہے سب کو سسپنس میں ڈالا ہوا ہے۔" لیکن اتنی باتیں سننے کے بعد بھی ہم کسی کا خط کھولنے کی غیر اخلاقی حرکت ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ پھر یہیں پر بس نہیں، بزرگوں کے جو طعنے سننے کو مل رہے تھے، ان کی ایک علیحدہ فہرست ہے۔ مثلاً ماموں نے اپنی بہن یعنی ہماری امی سے کہا، "کمال ہے دو قدم پر میرا گھر ہے، کم از کم مجھے تو پہلے بتا دیتے کہ عامر باہر جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔" تایا بھی چپ نہ رہ سکے بولے! "حد ہو گئی خون سفید ہونے کی۔ اگر ہمارا آپس میں آنا جانا نہیں تھا تو اس کا طلب یہ تھوڑا ہی تھا کہ تم ہم سے ہر بات پوشیدہ رکھو۔" تایا نے اپنے بھائی یعنی ہمارے ڈیڈی کو طعنہ دیا۔ خواتین کا سلسلہ تو خیر بالکل ہی جدا تھا۔ ان میں اکثر کی آنکھوں میں غصے اور حسد کے شعلے چمک رہے تھے کہ خدا خدا کر کے عامر آیا۔ ایک مرتبہ پھر گھر مبارک کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ وہ بے چارہ شرمندہ حیران پریشان سب کو دیکھ رہا تھا۔

"صبح آفس جانے تک تو میری منگنی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب....."

"بھئی جب بات کرو گے تو الٹی کرو گے۔" ایک کزن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تمہارا ٹکٹ آیا ہے سعودی عرب سے اور بھئی بڑے کمینے ہو تم، چپکے چپکے ساری تیاری کر لی ہمیں بتایا تک نہیں کہ کہیں ہم بھی ساتھ نہ ہو لیں۔" اب عامر کے حیران ہونے کی باری تھی۔ "بھئی! آپ سب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں اور مجھے تو اب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے۔ میں کیسے باہر جا سکتا ہوں۔" سب کی موجودگی میں اس نے خط چاک کیا۔ سب کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔ لفافے میں واقعی پی آئی اے کا ٹکٹ تھا۔ اور ایک نہیں دو۔ اور اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

"دوسرا ٹکٹ کامران کے لئے ہو گا۔" تائی اماں نے طنز سے کہا! کامران ہمارا دوسرا بھائی ہے جس نے اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے۔ اس وقت کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تبھی عامر کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ ماموں نے اس کے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا۔ جوں جوں سب خط پڑھتے گئے۔ کھسیانے ہوتے گئے۔ خواتین کے چہروں پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ اور غصہ کسی کو آیا تو وہ دبا تھی۔ جو وی سی آر اور رنگین ٹی وی کی خوشی میں سب کو چائے پلاتی پھر رہی تھی۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ عامر یعنی ہمارے بھائی جان نے بی اے کے امتحانات کے بعد ایئر ٹکٹنگ کا کورس کیا پھر ایک پرائیوٹ ادارے سے منسلک ہو گئے۔ پچھلے دنوں اس کے اسکول کے ایک ٹیچر اپنے بیٹوں کے پاس کینیا گئے تھے۔ وہاں سے ان تینوں کا ارادہ حج پر جانے کا تھا۔ لیکن بعد میں کسی وجہ سے ماسٹر صاحب کے بیٹے حج پر نہ جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے ٹکٹ واپس میرے بھائی کو بھیج دیئے کہ وہ انہیں کسی اور کے نام منتقل کر کے ان سے حاصل شدہ رقم گھر والوں کو دیدے۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔

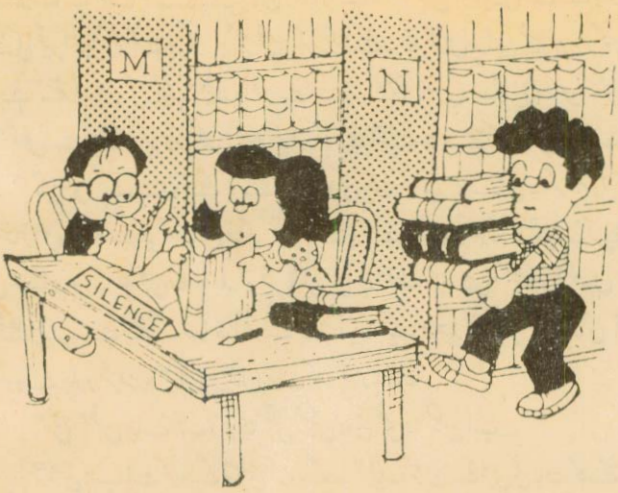

قلم کاروں کی شوخیاں

ثاقب محمود مصطفیٰ

مولانا چراغ حسن حسرت کے پاس امروز کی ایڈیٹری کے دنوں میں اسٹاف کا ایک آدمی کوئی مضمون بغرضِ اشاعت لکھ کر لایا۔

حسرت نے سارا مضمون پڑھا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

"یہ کیا ہے مولانا؟"

"مزاحیہ مضمون ہے جناب۔" مصنف نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"تو اس کے اوپر لکھ دیجئے نا، تاکہ لوگوں کو پتا تو چل جائے۔"

..... ○ ○ .....

مشہور شاعر سیماب اکبر آبادی ایک مرتبہ نہال سیوہاروی سے شکایتاً کہہ رہے تھے کہ ملک کی تقسیم میں پاکستان سے ناانصافی کی گئی ہے۔ نہ خزانے میں سے کچھ ملا نہ اسلحے کی تقسیم منصفانہ ہوئی۔"

نہال صاحب بولے۔ "سچ فرماتے ہیں آپ، شاعروں کے بٹوارے ہی کو دیکھئے، بڑے بڑے

شاعر ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان کے ساتھ یا ہم آئے یا آپ آئے۔"

○ ○

غالب کی صد سالہ برسی کے دنوں میں پاکستان نیشنل سینٹر کے صدر دفتر سے تمام نیشنل سینٹروں کو ہدایت دی گئی کہ دیگر تقریبات کے ساتھ ساتھ غالب کی زمینوں میں ایک عدد مشاعرے کا بھی اہتمام کریں۔ اس پر ایک ریزیڈنٹ ڈائریکٹر نے جواب لکھا تھا کہ "جناب میں نے شاعر تو سارے بک کر لئے ہیں مگر یہ بتایا جائے کہ غالب کی وہ زمین کہاں ہیں جن پر مشاعرہ کروانا ہے کیوں کہ مجھے تلاش کے باوجود ان کا سراغ نہیں مل رہا۔"

○ ○

ایک انگریز نے حسن نظامی سے پوچھا کہ انگریز تو ہمیشہ ایک ہی رنگ کے ہوتے ہیں لیکن ہندوستان کے لوگوں کے رنگ علاحدہ علاحدہ کیوں ہوتے ہیں؟

حسن نظامی نے فوراً حاضر دماغی سے جواب دیا۔ "گدھے ہمیشہ ایک ہی رنگ کے ہوتے ہیں لیکن گھوڑوں کا رنگ علاحدہ علاحدہ ہوتا ہے۔"

○ ○

مولانا حسرت موہانی کو ایک مرتبہ پولیس گرفتار کرنے آئی۔ مولانا بھی ایک اکھڑ طبیعت کے لیڈر تھے۔ انہوں نے کہا "میں اپنی گرفتاری میں تم کو کیوں مدد دوں، میں تو نہیں دیتا گرفتاری، تمہیں غرض ہے تو جس طرح ہو لے چلو۔" چنانچہ پولیس والوں نے انہیں اٹھالیا اور موٹر میں بٹھا کر لے گئے۔ اس پر مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار "زمیندار" میں لکھا:۔ "حضرت عیسیٰؑ تو ایک گدھے پر چڑھا کرتے تھے، مگر مولانا حسرت موہانی نے بیک وقت چار گدھوں پر سواری کی۔"

○ ○

جوش ملیح آبادی نے پنجابی کے اکھڑپن سے زچ ہو کر کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہا۔ "کنور صاحب! کیا آپ جانتے ہیں کہ دوزخ کی سرکاری زبان یہی آپ کی پنجابی ہوگی۔" کنور صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "تو پھر جوش صاحب! آپ کو ضرور پنجابی سیکھ لینی چاہئے۔"

○ ○

ایک مرتبہ اکبرالہ آبادی کے دوست نے انہیں ایک ٹوپی دکھائی جس پر قل ھو اللہ کڑھا ہوا تھا۔ آپ نے دیکھتے ہی فرمایا۔ "بھئی عمدہ چیز ہے، کسی دعوت میں کھانا ملنے میں دیر ہو جائے تو یہ ٹوپی پہن لیا کرو، سب سمجھ جائیں گے کہ انتڑیاں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

ایاز محمود

درِ حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

ہمارے اسکول میں میجک شو کا اہتمام ہوا۔ اس میں ایک صاحب نے جادو کے طرح طرح کے کمالات دکھائے۔ کیا یہ واقعی کوئی علم ہے اور اس کا سائنس کی رو سے کیا جواب ہے۔

(شہباز علی۔ ۔ کراچی)

جادو کے کرتب دکھانے والے حضرات دراصل مستقل مشق، پھرتی اور ہاتھ کی صفائی کے ذریعے تماشائیوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور دیکھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ لیکن نہایت باریک بینی سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ کھیل تماشے اور شعبدہ بازی کے علاوہ کچھ نہیں۔ جس وقت یہ حضرات تماشہ دکھاتے ہیں تو ان کا خاص لباس، باتیں اور اشارے حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی ایک لمحہ میں وہ ہاتھ کی صفائی دکھا جاتے ہیں۔ ان جادوگروں کا ایک مددگار بھی ہوتا ہے جو ان تمام چالبازیوں میں ان کی بھرپور مدد کرتا ہے۔

شعبدہ بازی کی تاریخ میں سب سے بڑا نام رابرٹ ہدونی کا ہے۔ ان کا تعلق فرانس سے تھا اور ان کا خاص کمال یہ تھا کہ یہ ہر قسم کی بندشوں، رسیوں اور زنجیروں وغیرہ سے خود کو آزاد کر لیتے تھے۔ ان حضرت کو زنجیروں میں جکڑ کر لکڑی کے ایک بکس میں مقفل کیا گیا اور پھر اس بکس کو کشتی میں رکھ کر سمندر کے بیچ لے جا کر غرق کر دیا گیا۔ کچھ ہی منٹوں میں یہ صاحب تو سطح آب پر آزاد ہو کر ابھر آئے لیکن تماشہ دیکھنے والے لوگ حیرت کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ ہدونی کا دعویٰ تھا کہ وہ روحانیت کے علم کو بروئے کار

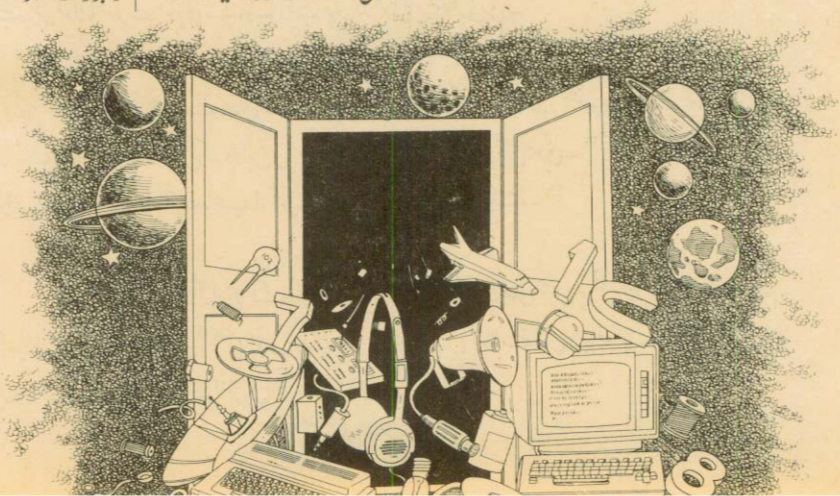

لاکر یہ کمالات دکھاتا ہے لیکن بعد میں ثابت ہو گیا کہ یہ سب کچھ نظر کا دھوکہ اور شعبدہ بازی تھی۔

ٹوپی سے خرگوش بر آمد کرنا جادوگروں کا مقبول ترین شعبدہ ہے۔ آیئے دیکھیں یہ کس طرح ہوتا ہے۔

۱۔ پہلے خرگوش کو اس تھیلے میں بند کیا۔

۲۔ یہ تھیلہ میز کے اس سرے سے لٹکا دیا جو حاضرین کی نظروں سے اوجھل ہے۔

۴۔ ٹوپی کو اس رخ سے حاضرین کی طرف کیا اور اسی اثنا میں تھیلہ ٹوپی کے اندر۔

۵۔ جادوگر کے مددگار نے ٹوپی کو پکڑا اور جادوگر نے پھرتی سے تھیلہ کا منہ کھول دیا۔

۶۔ لیجئے! خرگوش ٹوپی سے بر آمد ہو گیا۔

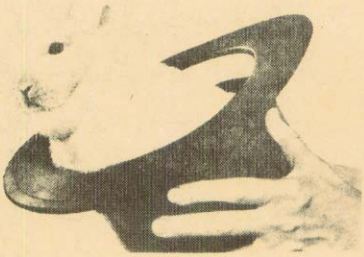

یہ ہمارا عام طور پر مشاہدہ ہے کہ کچھ لوگوں کی یادداشت دوسروں سے بہتر ہوتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا ہم اپنی یادداشت کو بہتر بنا سکتے ہیں؟

(سید عنبرین۔ ۔ بفرزون کراچی)

آپ نے یہ غور کیا ہوگا کہ بچپن کی بہت سی باتیں اس طرح ذہن میں محفوظ ہوتی ہیں کہ جیسے کل ہی کی بات ہو۔ خاص طور پر بچپن میں بڑوں سے کھائی جانے والی مار تو کبھی نہیں بھولتی۔ دوسری طرف آپ اور ہم کل ہی کی بات بھول جاتے ہیں۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ کل ہی آپ کے دوست نے آپ کو اپنے گھر کا پتا بتایا ہو جو اس وقت تو یاد رہا اور اب کوشش کے باوجود یاد نہیں آرہا۔ یہ حقیقت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یادداشت دراصل دو طرح کی ہوتی ہے۔ طویل مدت یادداشت اور مختصر مدت یا وقتی یادداشت۔ طویل مدت یادداشت کا تعلق دماغ کے بیرونی حصوں سے ہے جبکہ وقتی یادداشت دماغ کے درمیان میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا کسی حادثہ کی صورت میں سر پر چوٹ لگنے سے یہ ممکن ہے کہ کسی شخص کی طویل مدت یادداشت تو برقرار رہے لیکن اسے وقتی باتیں نہ یاد رہتی ہوں۔ کبھی کبھی اس کا الٹ بھی ہوجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ نے کسی ایسے شخص کے بارے میں پڑھا ہو جس کی یادداشت کھو گئی ہے اور وہ اپنے ماضی کی کوئی بات بھی یاد نہیں کر سکتا۔

ماہر نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ یادداشت کا تعلق ہمارے حواس سے ہے۔ اس حوالے سے ہم جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں وہ ہماری وقتی یادداشت کا حصہ بن جاتا ہے۔ لیکن مستقل مشق اور دہرانے سے ہم کسی بھی بات کو اپنی طویل مدت یادداشت کا حصہ بنا سکتے ہیں۔ یادداشت کے اچھے یا بُرے ہونے کا تعلق ہماری قوتِ مطالعہ سے بھی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ عمومی طور پر بغور مشاہدے کے عادی ہوتے ہیں ان کی یادداشت دوسروں سے بہتر ہوتی ہے۔

ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول کیسے کام کرتا ہے؟

(یاسر بن عبدالغفار۔ ۔ کراچی)

آپ ریڈیائی لہروں سے تو واقف ہوں گے۔ یہ وہ برقی مقناطیسی لہریں ہیں جو ہوا کے دوش پر دور دراز سے نشر ہونے والے ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرامات ہم تک پہنچاتی ہیں۔ جب آپ اپنے ٹی وی کی آواز کو کم و بیش کرنے یا چینل بدلنے کے لئے ریموٹ کنٹرول پر موجود متعلقہ بٹن کو دباتے ہیں تو آپ دراصل اپنے ٹی وی سیٹ کو مطلوبہ ہدایات دے رہے ہوتے ہیں۔ یہاں اس ہدایت کو ٹی وی تک پہنچانے کا کام انفراریڈ شعاعیں کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ریڈیو یا ٹی وی اسٹیشن سے آپ کے سیٹ تک ریڈیائی لہریں مختلف پروگرامات لے کر آتی ہیں۔

ریموٹ کنٹرول کا اہم ترین حصہ سیلیکون چپ ہوتا ہے جو بذاتِ خود سائنس کی ایک حیرت انگیز ایجاد ہے۔ نہایت ہی مختصر جسامت والے نگینہ نما چپس اپنے اندر ایک چھوٹی سی دنیا رکھتے ہیں۔ اس کی یہ دنیا ایک نہایت چھوٹے سے برقی سرکٹ پر مشتمل ہوتی ہے جو ہمارے ٹی وی کو مختلف ہدایات دیتا ہے۔ انفراریڈ شعاعیں یہ ہدایات لے کر ٹی وی سیٹ تک جاتی ہیں جہاں ایک حساس آلہ ان کو موصول کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ ہدایات ٹی وی سیٹ میں موجود چپ کے پاس جاتی ہیں جو ان کو سمجھتا ہے اور ٹی وی میں موجود برقی سوئچ تک ایک اشارے کے ذریعے منتقل کر دیتا ہے۔

آپ جوں ہی اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتے ہیں، آپ کی خواہش کے مطابق انفراریڈ شعاعیں آپ کا پیغام ٹی وی سیٹ تک پہنچا دیتی ہیں اور یوں آپ دور بیٹھے آواز کو کم یا زیادہ کر سکتے ہیں، چینل بدل سکتے ہیں، تصویر کا رنگ ہلکا یا گہرا کر سکتے ہیں اور اگر کوئی غیر دلچسپ پروگرام آرہا ہو تو ٹی وی سیٹ کو بند بھی کر سکتے ہیں۔

ریموٹ کنٹرول سے اور بھی کام لئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً آپ اپنے گھر کا دروازہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے کھول اور بند کر سکتے ہیں۔ اس کی مدد سے ماڈل ہوائی جہاز بھی اڑائے جاتے ہیں۔

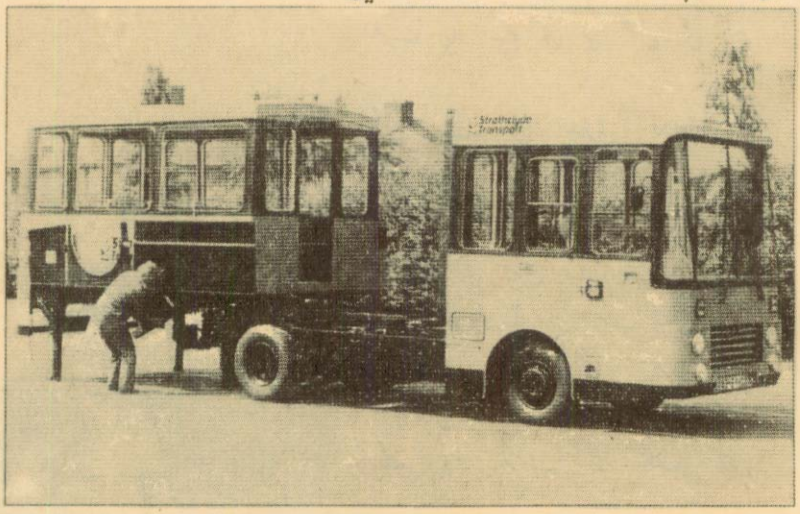

ایک تیر سے دو شکار

یہ بس صبح کے وقت بچوں کو اسکول چھوڑنے کے بعد ڈاک تقسیم کرنے والے ٹرک ۰ کام انجام دیتی ہے۔ بس کا پچھلا حصہ ہائیڈریک جیک کی مدد سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ ٹرک کی باڈی لگادی جاتی ہے۔

محمد اقبال نجمی

جگنو

میں راحت دلوں کی میں چاہت کی خوشبو
مجھے پیار سے سب ہی کہتے ہیں جگنو

مرے دم سے گھر میں عجب روشنی ہے
مرے پیار سے ہی یہ محفل سجی ہے

مجھی سے ہی ساری فضا ہے مہکتی
مجھے چاند آنگن کا کہتے ہیں سب ہی

شرارت بھی میری لگے سب کو پیاری
مجھے پیار کرتے ہیں سب باری باری

مری سن کے آہٹ مرے پاس آئیں
مجھے چوم کر سب بڑا لطف پائیں

میں امّی کا چندا میں ابّو کا جگنو
مرے پیار کا تو ہے دونوں پہ جادو

آخری قسط

آزادی کی صبح

سید نظر زیدی

تینوں دوست محمد بن قاسم، موذ اور سعید آپس میں باتیں کرتے ہوئے بصرہ شہر سے باہر پہنچے۔ یہاں وہ اپنے ایک اور دوست کا انتظار کرنے لگے جو ان کے واسطے سواری کے گھوڑے لینے گیا ہوا تھا۔ موذ اور سعید آئندہ عید کو ہونے والے سالانہ فوجی کرتبوں اور ان میں حصہ لینے کے اپنے ارادوں کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ اس

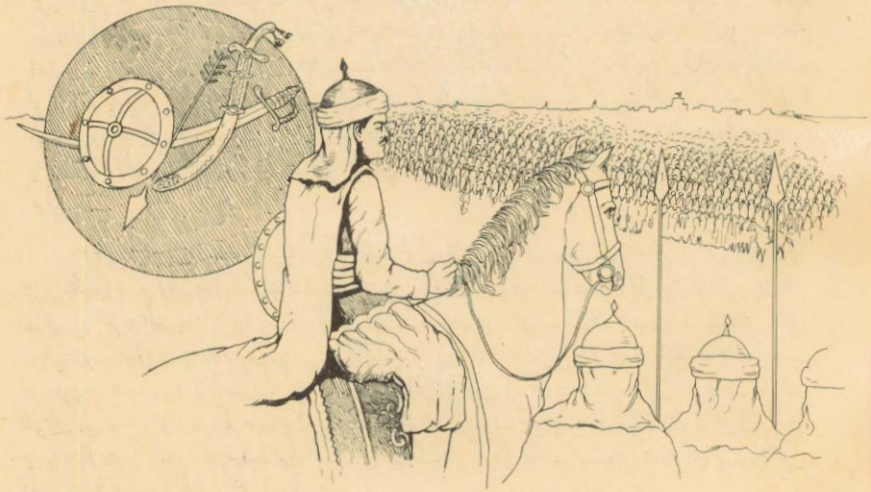

دوران ان کے گھوڑے پہنچ گئے اور وہ لوگ ان پر سوار ہو کر شہر سے ذرا دور دریا کنارے چلے گئے جہاں انہیں تیرنے، نیزہ بازی اور تلوار بازی کی مشق کرنی تھی۔ مشق کے بعد جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو ایک ڈاکو ان سے گھوڑے اور تلواریں چھیننے کی نیت سے وہاں آیا محمد بن قاسم سے مقابلے کے بعد شکست کھا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ڈاکو دراصل اسلامی فوج کے ایک بہادر جرنیل بدیل تھے جو ان نوجوانوں کا امتحان لینے آئے تھے۔

عید کے دن دمشق کے باہر ایک کھلے میدان میں فوجی کھیلوں کے مقابلے کا انتظام کیا گیا تھا اور دن بھر مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہے تھے۔ شام کو بالآخر ایک نوجوان تلوار بازی اور نیزہ بازی کے مقابلوں میں سب کو شکست دے کر میدان میں اکیلا رہ گیا۔ وہ چیلنج دینے کے انداز میں اپنا گھوڑا ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔ اس کے لباس سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے۔ چہرے کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ آخر میں امیر المومنین کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک اس نوجوان کے مقابلے میں آئے مگر شکست کھا گئے۔ اب وہ نوجوان ایک انوکھی شان سے میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ کوئی اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ سارا میدان اس کے لئے نعرہ ہائے تحسین سے گونج رہا تھا۔ امیر المومنین نے جب انعام دینے کے لئے اس کو اپنے قریب بلایا تو پتہ چلا کہ وہ محمد بن قاسم ہے۔ سب لوگ خوش ہوئے اور خاص طور پر امیر المومنین۔ محمد بن قاسم کی ذہانت علمی اور فوجی قابلیت کے پیش نظر امیر المومنین نے اس فندس کا والی مقرر کر دیا اور محمد بن قاسم اپنی والدہ سے مشورہ کرنے کی اجازت لے کر گھر چلا گیا۔

ان دنوں سندھ پر راجہ داہر کی حکومت تھی۔ یہ راجہ بہت ظالم اور بے ایمان شخص تھا۔ اس کی ایک برائی یہ تھی کہ اس نے اپنی سگی بہن سے شادی کر رکھی تھی۔ راجہ کے سارے درباری اس کے خوشامدی تھے، ایک دن بھرے دربار میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ لنکا سے آنے والے مسلمانوں کے دو تجارتی جہازوں کو لوٹ لیا جائے۔ ان جہازوں میں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ ان کو لوٹنے کا کام سمندری ڈاکوؤں کے ذمے لگایا گیا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ ایک نوجوان مسلمان کی قیادت میں لڑتے ہوئے عورتوں اور بچوں نے ان ڈاکوؤں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

ابھی وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک بار پھر کئی بڑے بڑے جہاز ان کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ یہ راجہ داہر کی فوج تھی۔ زید ہر قسم کی صورت سے نمٹنے کے لئے تیار تھا مگر سندھی فوج نے صلح کا جھنڈا لہرا کر دھوکا دیا اور چالاکی سے مسلمانوں کے دونوں جہازوں پر قبضہ کر کے عورتوں اور بچوں سمیت سب کو قیدی بنا لیا۔ راجہ داہر کے قید میں ان لوگوں پر بہت مظالم ڈھائے گئے۔ زید کو ان لوگوں نے دیوی پر قربان کرنے کا انتظام کر رکھا تھا مگر عین موقع پر چند نقاب پوش قربان گاہ پہنچے اور زید کو آزاد کرا لیا گیا۔ یہ ہندوستان کے مظلوم، نیچی ذات کے لوگ تھے جو راجہ کے ظلم سے تنگ آ کر اب آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ زید نے انہیں یقین دلایا کہ اسلامی حکومت ضرور راجہ داہر کو سزا دے گی اور یہاں کے غریب اور ستم رسیدہ لوگوں کو اس کے ظلم سے نجات دلائے گی۔ نقاب پوشوں کے سردار نے زید کو بحفاظت ملک عرب تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔

عراق کا حکام حجاج بن یوسف اپنے دربار میں ایک سفیر کی زبانی ترکستان اور اندلس میں مسلمانوں کی جنگی کامیابیوں کی خبریں سننے کے بعد یہ فرمان جاری کرتا ہے کہ دونوں سپہ سالاروں کو سختی سے بتا دیا جائے کہ ان کا کوئی سپاہی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ کسی مذہب والوں کی کوئی عبادت گاہ تباہ نہ ہو۔ ان کے باغ اور کھیت برباد نہ کئے جائیں۔ اسی دوران سندھ سے فرار ہونے والا نوجوان زید دربار میں پہنچتا ہے اور اپنی داستان سناتا ہے حجاج بن یوسف غصے سے کانپ اٹھتا ہے اور سندھ پر تمام کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ابتداً دو مسلمان جرنیلوں کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف اور امیر المومنین ولید بن عبدالملک۔ اور دیگر سردار یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ سندھ کی طرف بھیجی جانے والی فوج کا سالار محمد بن قاسم کو بنایا جائے حالانکہ امیر المومنین کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں مگر پھر بھی محمد بن قاسم کی قیادت میں فوج سندھ کی طرف بھیج دی جاتی ہے۔

اسلامی فوجیں دیبل کے قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ سندھ کے راجہ نے میدان میں نکل کر لڑنے کی بجائے قلعہ

بند ہو جانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسلامی فوج کسی طرح بھی قلعے کی مضبوط دیواروں کو توڑ نہیں سکتی۔ اس لئے خود ہی تھک کر چلی جائے گی۔ محمد بن قاسم نے کئی دن تک انتظار کیا اس کے بعد وہ کسی نئی منصوبہ بندی کے لئے قلعے کا چاروں طرف سے جائزہ لینے کو نکلا تو ایک جگہ اس کی ملاقات ایک بوڑھے ہندو سے ہو گئی جس نے بتایا کہ اگر قلعے کے اوپر لگا ہوا جھنڈا گرا دیا جائے تو مسلمانوں کو فتح ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ایک جلسہ عام میں اسلامی مساوات اور عدل کے عملی مظاہرے کے ساتھ پرجوش خطاب بھی کیا۔ ہندو عوام اپنے نئے آقاؤں سے بہت خوش تھے۔

دیبل کے ساحل کے قریب اغوا ہونے والی مسلمان عورتیں اور بچے راجہ داہر کی قید میں سخت مصیبتیں برداشت کر رہے تھے۔ لنکا کے رہنے والے ملاحوں کو تو ان لوگوں نے پہلے ہی قتل کر دیا تھا۔ راجہ داہر نے بھرے دریا میں قیدی مسلمان عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کیا اور ان سے ایمان سے پھر جانے کا مطالبہ کیا۔ مگر سب نے کفر اختیار کرنے پر موت کو گلے لگانے کو ترجیح دی۔ راجہ ان کی ضد کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ ان سب بچوں اور عورتوں کو عنقریب قید ہونے والی اسلامی فوج کے افسروں اور سپاہیوں کے سامنے قتل کیا جائے گا۔ اسلامی فوج دریائے سندھ کے اس پار حملے کی تیاری کے لئے منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ آخر ایک رات محمد بن قاسم نے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور سب سپاہی راہ میں حائل بہت سی مشکلات کو جاننے کے باوجود حملے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

لمبے چوڑے دریائے سندھ کو اس طوفانی موسم میں عبور کرنا بالکل ناممکن تھا جب کہ اس کے دوسرے کنارے پر دشمن فوج حملے کے لئے بالکل چوکنا تھی۔ مگر محمد بن قاسم نے ذہانت سے کشتیوں کا پل بنا کر یہ مسئلہ آسانی سے حل کر لیا۔ یہ دنیا کی تاریخ کا سب سے پہلا کشتیوں کا پل تھا۔ رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ تمام مسلمان سپاہی روزے سے تھے۔ ان کی تعداد بھی دشمن سے بہت کم تھی۔ مگر سب جذبہ جہاد اور شوق شہادت سے منور سینے لئے دشمن کے مقابلے میں صف آرا تھے۔ خاصی طویل لڑائی کے بعد بالآخر دشمن کی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور میدان جنگ ہندو فوج سے خالی ہو گیا۔

ایک ننھے سے معصوم بچے نے گود میں بیٹھے بیٹھے اپنی ماں کا چہرہ ٹٹولتے ہوئے کہا،

"امی! کتنے ہی دن ہو گئے میں نے آپ کا چہرہ نہیں دیکھا، آخر آپ ایسی اندھیری جگہ کیوں رہ رہی ہیں، کہیں روشنی کی جگہ چلئے نا!"

معصوم بچے کی یہ بات سن کر عورت کا دل بھر آیا، اس نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا،

عورت :۔ "ہاں ہاں میرے بچے! ہم بہت جلد ایک دوسرے کے پیارے پیارے چہرے دیکھیں گے۔"

بچہ :۔ "آخر کب دیکھیں گے امی! آپ کتنے ہی دن سے تو کہہ رہی ہیں۔"

عورت :۔ "بس میرے بچے اب صبح ہونے ہی والی ہے، جب ظلم کا اندھیرا حد سے بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ انصاف کے سورج کی روشنی پھیلا دیتے ہیں۔"

بچہ:۔ ”ہاں یہ تو ٹھیک ہے امی! اللہ میاں تو واقعی بہت اچھے ہیں، اللہ میاں ہی نے تو ہمیں پیدا کیا ہے نا؟“

عورت:۔ ”ہاں میرے لال، اس نے ہمیں اور دوسرے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہی سب کی حفاظت کرتا ہے۔“

یہ ماں اور بچہ ان بے گناہ عرب قیدیوں میں سے ہیں جنہیں سندھ کے ظالم راجہ کے حکم سے دیبل کی بندر گاہ سے گرفتار کیا گیا تھا، اب یہ بے گناہ قیدی زمین کے نیچے بنے ہوئے ایک اندھیرے قید خانے میں بند ہیں۔ نمی اور تاریکی کے علاوہ یہاں ان کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت مچھر، کھٹمل، پسّو اور دوسرے کیڑے مکوڑے ہیں۔ ننھے ننھے معصوم بچے ان کیڑوں کے کاٹنے اور اندھیرے کی وجہ سے گھبرا گھبرا کر روتے ہیں۔ باہر چلنے کے لئے ضد کرتے ہیں۔ لیکن بے بس مائیں انہیں تسلیاں دینے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔

پہلے پہلے انہیں ایک ایسے قید خانے میں رکھا گیا تھا جہاں دوپہر کے وقت دھندلکا سا ہو جاتا تھا، یا جس وقت پہرہ دار ان کے لئے کھانا لے کر آتے تھے تو کواڑ کھلنے سے ذرا دیر کے لئے روشنی پھیل جاتی تھی، لیکن اس جگہ وہ اس سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ کھانا لانے والے پہرے دار بھی اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے آتے تھے اور باہر ہی سے کھانا پھینک کر چلے جاتے تھے۔

ماں اور ننھے بچے کی اس بات چیت کے بعد کئی طرف سے ہلکی ہلکی سسکیوں اور دعائیں مانگنے کی آوازیں آنے لگیں، معلوم ہوتا تھا، ننھے بچے کی یہ باتیں سن کر سب قیدیوں کو حد سے زیادہ رنج ہوا تھا۔

ننھا بچہ اپنی ماں کی یہ بات سن کر چپ ہو گیا تھا، لیکن دوسروں کے رونے کی آوازیں سن کر اس کا دل بھی بھر آیا۔ روتے روتے بولا۔ ”لیکن اچھی امی! جب اللہ تعالیٰ سب کی حفاظت کرتا ہے تو پھر وہ ہماری.....!“

عورت نے جلدی سے بچے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کسی قدر ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ سخت گناہ کی بات ہے، ایک مسلمان بچے کو ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔“

بچہ:۔ ”لیکن امی جان! سوچئے تو آپ کتنے دن سے کہہ رہی ہیں۔ بس اب صبح ہونے والی ہے لیکن اللہ میاں ہماری اس کوٹھڑی میں صبح ہی نہیں کرتے!“

عورت:۔ ”صبح ضرور ہوگی میرے لال! اس کے لئے اللہ میاں سے دعا مانگو۔“

بچہ:۔ ”دعا تو روز ہی مانگتا ہوں، اگر آپ کہیں تو اس وقت بھی مانگوں!“

عورت:۔ "ہاں ضرور مانگو!"

بچہ:۔ (دونوں ہاتھ اٹھا کر) "یا اللہ! مجھے اس اندھیرے میں بہت ڈر لگتا ہے۔ یا اللہ! اب تو جلدی سے صبح کر دے۔ روشنی پھیلا دے تاکہ میں اپنی پیاری امی کا منہ دیکھ سکوں۔ یا اللہ.....!"

بچہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ عورت روتے روتے ایک دم زور سے چلائی۔ "دیکھو سعد! وہ صبح.....!" عورت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

اس اندھیری کوٹھڑی کے ایک کونے میں روشنی کی ہلکی سے کرن لرز رہی تھی، جیسے کوئی شخص مشعل لے کر آہستہ آہستہ زینہ اتر رہا ہو اور اس کے چلنے کی وجہ سے کبھی مشعل کی روشنی کم ہو جاتی ہے اور کبھی زیادہ۔

روشنی دیکھ کر تمام بچے اور عورتیں اونچی آواز میں چلانے لگے۔ "روشنی روشنی! وہ دیکھو روشنی!"

تھوڑی دیر بعد قید خانے کا بھاری دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور آٹھ دس آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک سندھ کا رہنے والا اور باقی سب مسلمان تھے۔ اتنے دن بعد روشنی اور روشنی سے بھی زیادہ مسلمانوں کی صورتیں دیکھ کر ان معصوم عورتوں اور بچوں کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ حیران ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

جو لوگ مشعلیں لئے ہوئے باہر سے آئے تھے ان میں زید بھی تھا، اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میری بے گناہ بہنو! بچو! تمہاری مصیبت کے دن ختم ہو گئے۔ سندھ کا ظالم راجہ مارا گیا اور اب یہ پورا ملک ہمارے قبضے میں ہے۔"

یہ ایک ایسی بات تھی جس کا ان عورتوں اور بچوں کو آسانی سے یقین نہ آسکتا تھا۔ زید کو پہچان کر انہوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ "راجہ کب مارا گیا۔ اسے کس نے مارا۔ یہ ملک کب فتح ہوا؟" زید نے مختصر لفظوں میں انہیں سارا حال سنا دیا اور اس کے بعد ان سب کو ساتھ لے کر اس منحوس قید خانے سے باہر آ گیا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

دیبل کے بعد آج اروڑ میں بھی اسلامی فوج کے سپہ سالار محمد بن قاسم کا دربار لگا ہوا ہے۔ یہ دربار سادگی میں تو ویسا ہی ہے لیکن آج شامل ہونے والے ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اتنی زیادہ کہ آسانی کے ساتھ ان کی گنتی بھی نہیں ہو سکتی۔

بے گناہ عرب عورتوں اور بچوں کو راجہ داہر کی قید سے چھڑانا محمد بن قاسم کے دل کی سب سے بڑی

تمنا تھی۔ اروڑ کی لڑائی جیتنے کے بعد مسلمان فوج نے بے حد کوشش کی لیکن قیدی عورتوں اور بچوں کا کچھ پتہ نہ چلا، آخر ایک نیک دل ہندو کی کوشش سے یہ عورتیں اور بچے بھی مل گئے۔ اس وقت وہ بھی دربار میں بیٹھے ہیں۔

قاعدے کے مطابق اسلامی فوج کے سپہ سالار کو آج بے حد خوش ہونا چاہئے تھا۔ آج انہوں نے ملک کے راجہ کو ہرا کر اس کی راجہ دھانی پر قبضہ کیا ہے اور وہ عورتیں اور بچے بھی مل گئے ہیں جن کی طرف سے وہ ایک طرح مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے چہرے سے بے حد رنج ظاہر ہو رہا ہے۔

آپ حیران ہونگے ایسے خوشی بھرے موقع پر رنج کیسا! تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس لڑائی میں ان کے بہادر دوست، موز بن ثابت اور سعید، دونوں شہید ہو چکے ہیں۔ محمد بن قاسم نے اپنے ان دونوں بہادر ساتھیوں کے بارے میں وصیت کی تھی، "اگر میں شہید ہو جاؤں تو انہیں فوج کا سالار بنایا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے۔ خود وہ زندہ ہیں اور موز بن ثابت اور سعید، دونوں شہید ہو چکے ہیں۔

آپس میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ راجہ کو قتل کرنا چاہئے۔ وہ دونوں لڑتے بھڑتے راجہ کے ہاتھی کے پاس پہنچ گئے اور ظالم راجہ انہی دونوں بہادر دوستوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد محمد بن قاسم اپنی جگہ سے اٹھے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے اور اس کے سچے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اوپر درود بھیجنے کے بعد کہا،

"سندھ کے رہنے والے بھائیو! اروڑ کی لڑائی میں راجہ داہر مارا جا چکا ہے۔ اس کا بیٹا جے سنگھ اور چند اور سردار اس خیال میں ہیں کہ راجہ زندہ ہے اور بہت جلد ایک بڑی فوج لے کر ہمارے مقابلے کے لئے آئے گا۔ اس امید کی وجہ سے انہوں نے ابھی تک ہار نہیں مانی۔ لیکن ہم بہت جلد ان کی غلط فہمیاں دور کر دیں گے۔ آج تمہیں یقین کر لینا چاہئے کہ اس ملک سے ظلم اور بے انصافی کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

راجہ کی حکومت ختم ہونے کے بعد آج تمہارے ملک میں آزادی کی صبح ہوئی ہے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اچھوت ہو یا برہمن۔ تم میں سے ہر آدمی پورے طور پر آزاد ہے۔ تمہارے مذہب اور رہنے سہنے کے طور طریقوں میں ذرا بھی رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی۔ تمہارے گھر بار، دوکانیں اور زمین تمہارے پاس رہے گی۔ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، کوئی تمہیں بیگار میں نہ پکڑ سکے گا۔ تم میں سے کسی کو کم درجے کا نہ سمجھا جائے گا۔ سب کی عزت برابر ہوگی اور حکومت ہر طرح تمہاری حفاظت کرے گی۔"

یہ چند باتیں کہہ کر محمد بن قاسم پھر اپنی جگہ بیٹھ گئے اور ان کا مطلب سمجھنے کے بعد سندھ کے لوگوں کا خوشی کے مارے یہ حال ہوا کہ سفید داڑھیوں والے بوڑھے بھی بچوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے۔

ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر اونچی آواز میں کہا۔ "سردار! تم آدمی نہیں سچ مچ دیوتا ہو۔ ہم تمہاری پوجا کریں گے۔ اپنے مندروں میں تمہاری مورتیاں بنا کر رکھیں گے۔"

بوڑھے کی یہ بات سن کر محمد بن قاسم پھر اپنی جگہ سے اٹھے اور بوڑھے کی طرف دیکھ کر کہا، "بابا! تم میرے بارے میں ایسی باتیں مت سوچو، میں تو تمہاری طرح کا ایک معمولی آدمی ہوں، اگر میری اور میرے ساتھیوں کی کوششوں سے تمہاری بھلائی کا کوئی کام ہوا ہے تو یہ کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ تو ہر آدمی کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے کوشش کرتا رہے اور اگر تم میری تعریف ہی کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ میرے بت بنا کر ان کی پوجا شروع کر دو۔ یہ تو ایک بہت بُری بات ہے۔ خدا کے سوا کسی انسان کے آگے سر جھکانا بہت بڑا گناہ ہے۔ میری عزت اور تعریف تو اس طرح ہو سکتی ہے کہ تم سب بھی اچھے کاموں میں لگ جاؤ۔ بُری عادتیں چھوڑ دو۔ خدا کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو۔"

"ہم ضرور ایسا ہی کریں گے، ہم ضرور ایسا ہی کریں گے۔" جلسے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ چلّا اٹھے۔ ان کی یہ آوازیں سن کر محمد بن قاسم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور آہستہ آہستہ کہا، "میرے اللہ میں نے تیرے حکم کے مطابق تیرے ان مظلوم اور کمزور بندوں کو ظالم کے پنجے سے چھڑا دیا ہے اب تو ان سب کو سیدھے راستے پر چلا۔"

دعا مانگ کر محمد بن قاسم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب وہ جا رہے تھے کیا بوڑھا اور کیا بچہ۔ کیا عورت اور کیا مرد۔ پورے جوش سے ان کا نام لے لے کر نعرہ لگا رہے تھے۔ کتنی ہی عورتوں نے تو آگے بڑھ کر ان کے راستے میں اپنے دامن بچھا دیئے۔

آج مسلمانوں کی خوشی کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا لیکن سندھ کے رہنے والے عام آدمی بھی حد سے زیادہ خوش تھے، انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے آج سچ مچ ان کے ملک میں آزادی کی صبح ہوئی ہے۔

مصلحت

عامر منیر

"نہیں بھئی یہ بات حلق سے نہیں اترتی۔" توفیق نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"بعض باتیں تجربے سے ثابت ہو جاتی ہیں۔ ایک دن تم بھی اس حقیقت کو پا جاؤ گے....." عامر نے بات ختم کر دی۔

توفیق اور عامر گہرے دوست تھے لیکن نظریات ان کے آپس میں اس طرح ٹکراتے تھے جیسے گاندھی اور قائداعظم کے۔ آج بھی شام کو دونوں کھیل کے میدان سے واپسی پر بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ وہ موضوع تھا جس پر اکثر ہی دونوں کے درمیان بحث و مباحثے کا طوفان اٹھا رہتا تھا۔ موضوع سیدھا سادہ تھا۔ عامر کا خیال تھا کہ خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کا پتا ہمیں شروع میں نہیں ہوتا۔ لیکن توفیق کا خیال تھا کہ مصلحت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ انسان اپنی غلطیوں کے لئے مختلف قسم کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔ مصلحت بھی اسی کا نام ہے۔ دونوں دوست اپنے اپنے حق میں دلائل دیتے لیکن قائل کوئی نہ ہوتا اور خوب بحث و تکرار کے بعد نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

توفیق عامر سے کہہ رہا تھا کہ اس نے اوور کی پہلی گیند پر چھکا لگایا لیکن دوسری گیند پر بری طرح بولڈ ہو گیا بھلا اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ عامر نے جواب دیا "ہو سکتا ہے اگر تم کھیلتے رہتے اور

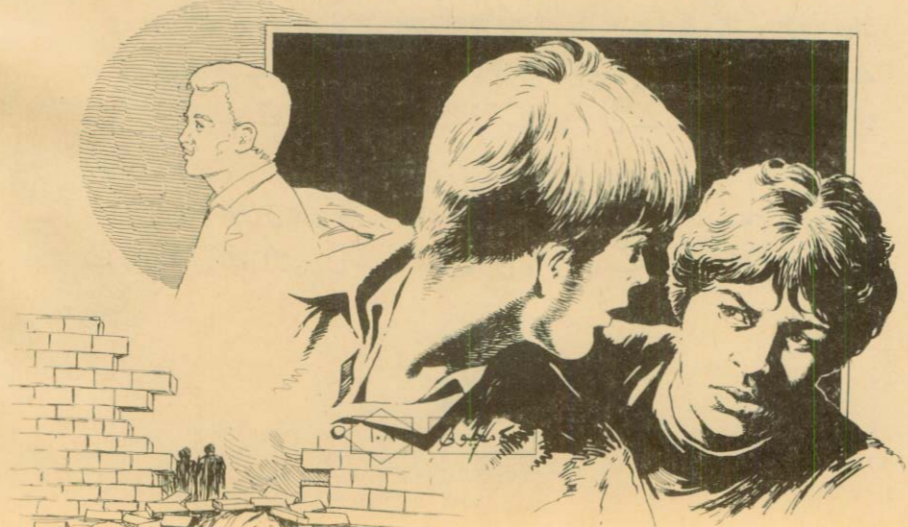

اگلی گیند پر زخمی ہو جاتے توفیق نے قہقہہ لگایا "یہ ہو سکتا ہے" بھی خوب ہے جو واقعہ ہوا نہیں اس کے متعلق تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو" عامر نے کہا اس کے بارے میں جس طرح میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تم بھی کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس واقع کے جتنے ہونے کے امکانات ہیں اتنے ہی نہ ہونے کے امکانات ہیں" بحث پھر الجھ گئی اور دونوں نے موضوع کو اگلے روز پر ٹالتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

توفیق نے گھر پہنچ کر لان پہ نگاہ دوڑائی کیاریاں خشک تھیں اس نے فوراً پائپ کھولا اور کیاریوں میں رکھ دیا۔ گھر کے سامنے کے رخ پر اس نے محنت سے دو تین کیاریوں میں گلاب لگا رکھا تھا اور انہیں دل و جان سے عزیز رکھتا تھا۔

پانی آہستہ آہستہ کیاریوں میں پھیل رہا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر مچھروں کی زد میں آنے کی بجائے اندر چلنا مناسب سمجھا۔

"توفیق بیٹے آؤ بازار کا ایک چکر لگا آئیں ناشتے کا سامان ختم ہے۔"

اس نے اپنے ابو کی آواز سنی تو ہاتھ دھو کر ابو کے ساتھ چل پڑا۔ پون گھنٹے بعد جب وہ دوبارہ گھر میں داخل ہوئے تو ابو لان کی طرف دیکھ کر چلا اُٹھے۔

"ارے ..... یہ کیا... ؟ تم پائپ کھلا چھوڑ گئے تھے؟ دیوار کے ساتھ پانی کھڑا ہو گیا ہے۔ ایک تو کل سفیدے کے اس درخت کی ٹہنی گرنے سے اس میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور یہ ویسے ہی گرنے والی ہے اور اوپر سے یہ پانی ..... اگر رات کو آندھی آگئی تو مجھے یقین ہے کہ دیوار گر جائے گی، موسم بھی خراب ہی ہے۔"

توفیق شرمندہ سا ہو گیا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ خواہ مخواہ ہی پائپ کھلا چھوڑ گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ آدھ پون گھنٹے سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہوگی۔ خیر اس نے پائپ بند کر کے سمیٹا اور پہاڑوں کی سمت دیکھنے لگا سیاہ بادل اٹھ رہے تھے۔ وہ دل میں طوفان نہ آنے کی دعا مانگتے ہوئے اندر چلا گیا۔

رات آدھی بیت چکی تھی۔ توفیق بستر پر آنکھیں بند کئے پڑا ہوا تھا۔ کبھی وہ سو جاتا پھر جاگ پڑتا۔ ذہن فکر مند ہو تو بھلا نیند کہاں آتی ہے۔ باہر ہوا کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ آندھی آئی تو دیوار گر جائے گی اور ابو کا سارا نزلہ اس پر ہی گرے گا۔

کافی دیر تک وہ جاگتا رہا جلد ہی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

رات کے کسی پہر اچانک توفیق کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے وہ خالی خالی نظروں سے ادھر

ادھر دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ باہر ہوا آندھی کی شکل اختیار کر چکی تھی اور کھڑکی کے پٹ بج رہے تھے۔ وہ فکر مند سا ہو گیا۔ اور فوراً اٹھ کر کھڑکی کی طرف آیا تاکہ اپنا اطمینان کر سکے۔

کھڑکی سے باہر برآمدے کی زرد روشنی میں نظریں دوڑاتے ہی وہ دھک سے رہ گیا۔ دیوار گر چکی تھی ..... اور پھر ہوا کی سائیں سائیں اسے اپنے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح محسوس ہونے لگی۔

اچانک اسے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

"اوہ" خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اس نے دیکھا اس کے ابو ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ابھی وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ابو کو جھک کر دیوار کے ملبے سے کوئی چیز گھسیٹتے دیکھا۔ اسی وقت گلی کا چوکیدار بھی آ گیا۔

صاحب جی ..... یہ کیا ہوا "چوکیدار کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میری اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اوہ ..... اس کے ابو کے منہ سے نکلا "کیا ہوا صاحب۔" چوکیدار نے چونک کر پوچھا۔

"اس نے منہ پر کپڑا باندھ رکھا ہے۔ ضرور کوئی چور ہو گا۔ میرے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہو گا لیکن دیوار پر چڑھتے ہوئے دیوار گر گئی ہو گی....."

توفیق اس سے آگے نہ سن سکا۔ وہ سب کچھ جان گیا تھا اگلے دن اس نے عامر کو رات کا واقعہ بتایا۔ اور عامر نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں نے کہا تھا نا دوست۔" وہ بولا بعض باتیں تجربے سے ثابت ہو جاتی ہیں۔ اب اگر تم رات پانی کا پائپ رکھ کر نہ بھولتے اور رات کو آندھی نہ آتی تو چور گھر کا صفایا کر چکا ہوتا تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح انسان کے دل میں اصل بات ڈالے بغیر حادثات کے بچاؤ کا سبب کرتا ہے....."

"مجھے افسوس ہے دوست ....." توفیق نے کچھ کہنا چاہا لیکن عامر بولا "کوئی بات نہیں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے اندر اس تبدیلی میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو گی جس نے اتنے عرصے تک تم کو اصل حقیقت سے دور رکھا..... وہ چاہتا تو شروع میں ہی تمہارے دل میں یہ بات ڈال سکتا تھا....."

اور توفیق صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

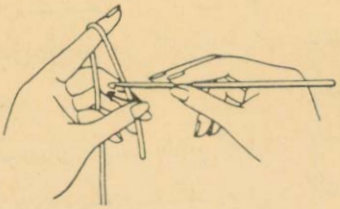

سوئٹر بُننے کا انوکھا مقابلہ

عبدالباسط

مقابلے کئی قسم کے ہوتے ہیں مثلاً معلومات عامہ کا مقابلہ، تقریر کا مقابلہ، کھیلوں کے مقابلے۔ آپ نے بھی مقابلوں میں حصہ لیا ہوگا مگر آج ہم آپ کو ایک انوکھے مقابلے کے بارے میں بتائیں گے یہ ہے سوئیٹر بننے کا انوکھا مقابلہ۔ ۱۹۸۴ء میں سب سے پہلے انٹر نیشنل وول

سیکریٹریٹ نے سوئٹر بننے کا مقابلہ شروع کیا تھا جو لاکھوں گھرانوں کے لئے دلچسپی کا باعث بنا اس مقابلے میں حصہ لینے کی شرط عجیب بھی ہے اور سخت بھی یعنی سویٹر کا ڈیزائین بیٹے کو تیار کرنا ہوتا ہے اور پھر خاندان کا کوئی دوسرا رکن سوئیٹر کی بنائی کرتا ہے۔

اس کے بعد یہ مقابلہ جاپان، نیوزی لینڈ اور دوسرے ملکوں میں بھی منعقد ہوا ۱۹۸۹ء کے اواخر میں یہ مقابلہ شنگھائی شہر میں منعقد ہوا۔ اس میں بیجنگ، شنگھائی اور سوچو کے چھ سو سے زائد خاندانوں نے شرکت کی انٹرنیشنل وول سیکریٹریٹ کے فیصلے کے مطابق شنگھائی سے مقابلوں میں حصہ لینے والوں کے سویٹروں کی بنائی کا معیار مجموعی طور پر سب سے بلند تھا بیجنگ کے نو عمر وانگ ہانگ شدہ کے ''عوام امن سے محبت کرتے ہیں'' کے عنوان سے تیار کردہ سویٹر کو بے حد سراہا گیا اور اسے انعام کا مستحق قرار دیا گیا طلائی تحفہ حاصل کرنے والا ڈیزائن ''بوڑھا بیل'' تھا جس کا ڈیزائنر

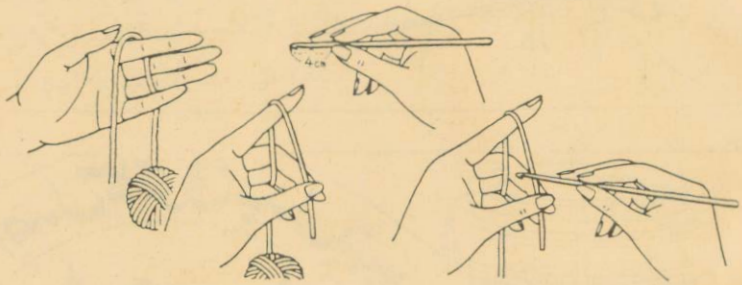

شنگھائی کا چھٹی جماعت کا ایک طالب علم لوجیون تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے نانا جو چین کے مشہور شاعر لومانگ تھے کی بنائی ہوئی تصویر "بوڑھا بیل" کا شیدائی رہا ہے۔

مقابلے کے دوران اس کے والدین حصول تعلیم کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ ڈیزائن کے تصور میں اس کو اپنے والدین سے مدد تو نہ ملی مگر اسے لوجیون کی خوش قسمتی کہئے کہ عالمی فنون لطیفہ کی تعلیم کے انسٹی ٹیوٹ کے محقق مسٹر چو سونگ ٹھاؤ نے سوئیٹر کا ڈیزائن تیار کرنے کے سلسلے میں اس کی ہر طرح سے مدد کی۔ آخر میں لوجیون کی چچی نے ایک تصوراتی بوڑھے بیل کی تصویر کو اون اور سلائیوں کی مدد سے صحیح طور پر سویٹر پر اتار لیا۔ بچوں نے اپنی مرضی سے ڈیزائن بنائے تھے... مگر ان کے عجیب و غریب تصورات کو بنائی کے ذریعے سویٹر میں منتقل کرنا ایک مشکل کام تھا سویٹر بنانے والی ماہر چھن ہونگ نے مقابلے میں شرکت کرنیوالے ایک خاندان کو لیکچر بھی دیا۔ علاوہ ازیں شنگھائی ٹیکسٹائل یونیورسٹی کے شعبہ ملبوسات کے پر مہند ہوانگ یوانگ چھینگ نے سائیکل پر سوار ہو کر رنگ برنگی اون کے پیکٹ ہر بچے کے گھر پہنچائے اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "انگوروں سے بھرا ہوا باغ" "بیجنگ اوپیرا کے نقاب" اور عوام امن سے محبت کرتے ہیں جیسے ممتاز شاہکاروں میں چین کے کتنے ہی افراد کی کاوشیں اور امیدیں شامل ہیں۔

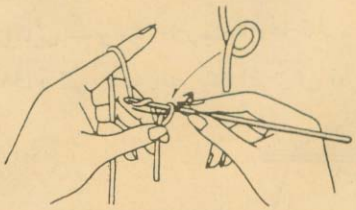

یہ کیا ہے؟

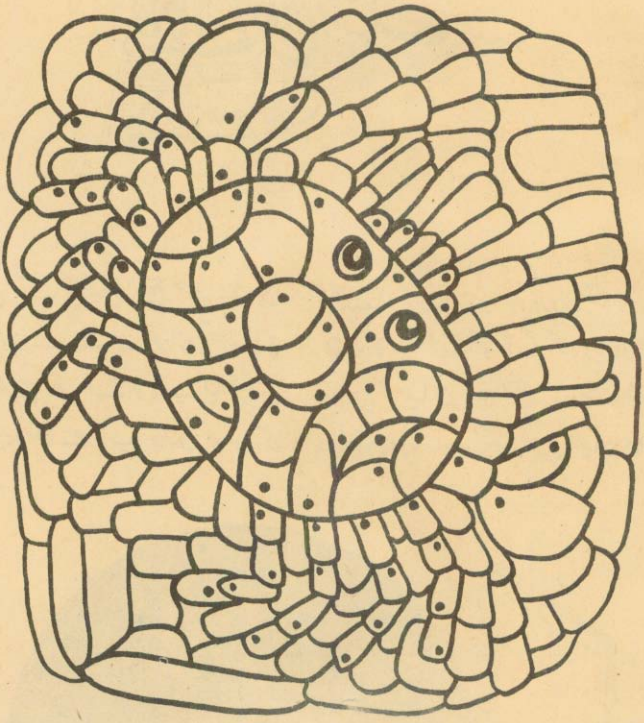

نقطے والے خانوں میں رنگ بھریئے، ابھی پتہ چل جائے گا کہ کیا چھپا ہوا ہے؟

گائے کی دستک

سہیل احمد صدیقی

اگر کبھی آپ کی آنکھ صبح سویرے کسی دستک کی آواز سے کھلے اور دروازہ کھولنے پر کوئی گائے کھڑی نظر آئے تو آپ کیا محسوس کریں گے؟ ہوسکتا ہے آپ سوچیں کہ یہ کسی گوالے کی شرارت ہے، خود دروازہ کھٹکھٹا کر چھپ گیا ہوگا اور گائے کو آگے کر دیا ہوگا۔ ذرا سوچیں کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ دستک خود گائے نے دی ہو؟ آپ یقین کریں ایسا ہوچکا ہے۔

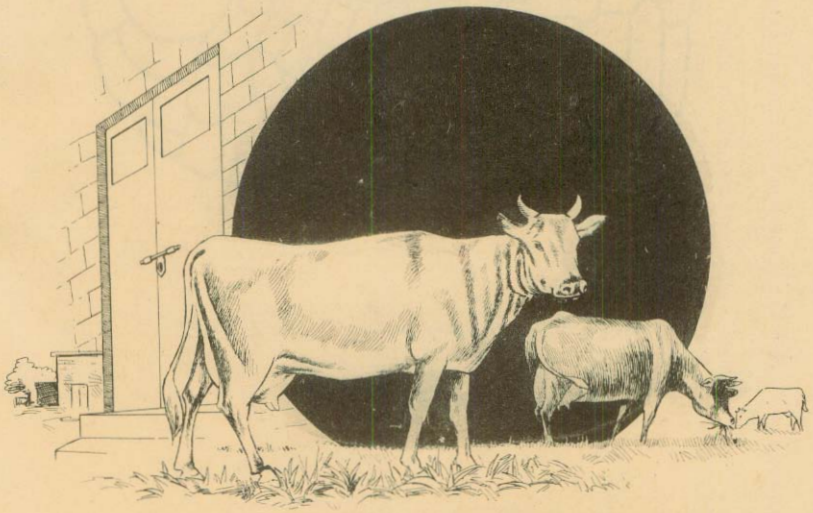

دستک پر اکثر میں نے دروازہ کھولا ہے اور باہر ایک صحت مند مضبوط سینگوں والی گائے کو کھڑے پایا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ سرمئی رنگت کی ایک گائے عموماً صبح ساڑھے چھ بجے سے آٹھ بجے کے درمیان اور پھر شام عصر اور مغرب کے درمیان، کبھی اکیلی اور کبھی دوسری گائیوں کے ساتھ ہمارے گھر پر آیا کرتی تھی اور دستک دیا کرتی تھی تاکہ کچھ کھانے کو مل سکے۔ اس کے کھٹکھٹانے کا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا اور میں نے یہی سوچا کہ یہ کام اس کا رکھوالا کرتا ہوگا، پھر یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ پہلی دستک کے بعد کچھ دیر انتظار کرتی کہ شاید کوئی دروازہ کھولے، اگر کسی وجہ سے دروازہ نہ کھلتا تو دوبارہ پھر سہ بارہ دستک دیتی، دروازہ کھلتا اور ہمیں اس کے سینگ نظر آتے۔ ہم گھر والوں میں سے کوئی روٹی یا ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈال دیتا، وہ کھالیتی، پیٹ بھر جاتا تو چلی جاتی ورنہ آدھا آدھا گھنٹہ سینگ دروازہ کی کنڈی سے اڑائے کھڑی رہتی، کبھی کھٹکھٹاتی اور کبھی آواز بھی نکالتی تھی۔ سراغ لگانے پر معلوم ہوا کہ صبح کے وقت عموماً یہ گائے اور اس کی ساتھی گائیں رکھوالے کے ہمراہ نہیں ہوتیں۔ باڑہ قریب ہے، اس لئے عموماً وہ خود ہی چل پڑتی ہیں اور دستک دینے کا کام سینگ سے انجام دیتی ہیں۔ ہماری حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب اس گائے نے دروازہ کھلنے میں تاخیر یا روٹی نے ملنے اور دھتکارے جانے کی صورت میں کنڈی باہر سے لگانی شروع کر دی۔ اسے ایسا کرتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ عجیب و غریب گائے اپنی سج دھج کے اعتبار سے دیگر مویشیوں کی قائد نظر آتی تھی، دوسری گائیں اس کی دیکھا دیکھی روٹیوں پر جھپٹتی تھیں پھر رفتہ رفتہ "ہماری" گائے کمزور ہونے لگی تو اس چھینا جھپٹی میں پیچھے رہ گئی۔ ہم سے پہلے وہ ہمارے پڑوسی کے گھر میں دستک دیا کرتی تھی۔ پھر ان کے مار بھگانے کے بعد اس نے ہمارا گھر چنا۔ وہ ہماری گلی میں ہمارے گھر کے علاوہ شاذ و نادر ہی کسی گھر سے کچھ مانگتی، جب ہمارے یہاں سے سختی ہوئی تو اس نے ہمارے یہاں آنا کم کر دیا، اسی گلی میں دو تین گھر اور دیکھ لئے، مگر وہاں وہ دستک کم ہی دیا کرتی تھی۔ بس جاکر رستہ بند کر دیتی تھی، پھر اس نے آنا چھوڑ دیا۔ دوسری گائیوں نے اس کی جگہ لینے کی کوشش کی، مگر معمول نہیں بنایا۔ ایک دن اس کے رکھوالے نے بتایا کہ وہ انوکھی گائے چھ بچھڑوں کو سوگوار چھوڑ کر مر گئی، ہم سب کو بہت صدمہ ہوا۔

میں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ شاید یہ گائے دراصل کوئی جن ہو جس نے کسی خاص مقصد کے لئے بہروپ بھرا ہو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حقیقت کیا تھی۔ ایک اور بات..... اگر یہ گائے یورپ یا امریکا میں ہوتی تو اس کی بڑی شہرت ہوتی اور گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں اس کا نام بھی شامل ہو جاتا۔

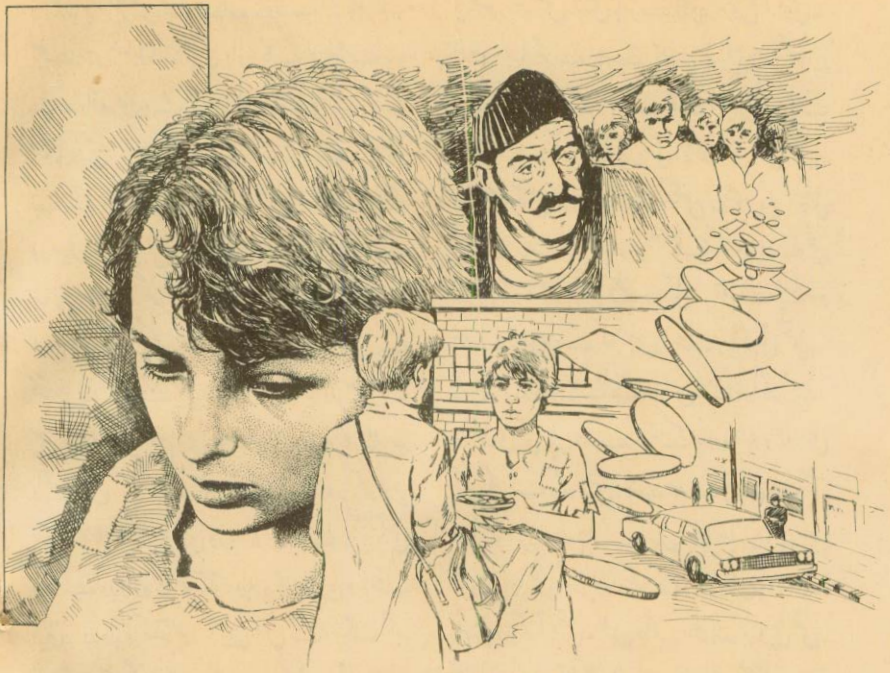

محمد عمر احمد خان

"یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ سارا دن دھکے کھاؤ۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، بھیک مانگو اور اوپر سے استاد کی گالیاں اور مار بھی کھاتے رہو۔" جھنجھلا کر شوکت نے سوچا۔
اسے جھوٹ سے نفرت تھی جب کہ استاد تمام لڑکوں کو جھوٹ کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ لڑکوں سے کہتا۔

پناہ

"جھوٹ بولو! جھوٹ بول کر بھیک مانگو۔ جھوٹ بول کر مانگنے سے بھیک زیادہ ملتی ہے۔ لوگ زیادہ ترس کھاتے ہیں۔ سچ بولنے سے کچھ نہیں ملتا۔ سچ کی کوئی قدر نہیں کرتا، سب جھوٹ کی قدر کرتے ہیں۔"

استاد جھوٹ بولنے کے طریقے سکھاتا۔ کہتا:

"لوگوں کو بتاؤ تم یتیم ہو، کھانے کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں، بوڑھی ماں ہے، بہن بھائی ہیں، گھر میں دو دن سے فاقہ ہے، بڑی بہن کی شادی کرنی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ کبھی ترکیب نمبر ۲ سکھاتا کہتا:

"لوگوں کو بتاؤ میری پانچ بہنیں جوان ہیں ان کی شادی کرنی ہے۔ بوڑھا باپ ہے۔ کل اس کا ہاتھ آرا مشین میں آگیا۔ اس کے علاج کے لئے پیسہ چاہئے۔ آپ لوگ میری مدد فرمائیں۔ اللہ آپ لوگوں کو بہت دیگا۔"

کبھی لڑکوں کو ترکیب نمبر ۳ سے آگاہ کرتا کہتا:

"لوگوں کو بتاؤ کل میرے بھائی کے گردے کا آپریشن ہے۔ میرے پاس اس کی دوائیوں کے لئے پائی پیسہ نہیں۔ برائے مہربانی میری مدد فرمائیں اللہ آپ کا بھلا کریگا۔ اللہ آپ کی مرادیں پوری کرے گا۔"

استاد نہ صرف ترکیبیں بتاتا بلکہ ایکٹنگ کر کے دکھاتا۔ کبھی اپنے ہاتھ ٹیڑھے کرلیتا کبھی اندھا ہو جاتا تو کبھی لنگڑا بن جاتا۔

اس کا کہنا تھا کہ جھوٹ بول کر اور جھوٹ کی اداکاری کے ذریعے ہی لوگوں کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ہمدردی اور رحم اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب جھوٹ بولا جائے، جھوٹ کی اداکاری کی جائے۔

شوکت استاد کی تمام باتیں سنتا لیکن ان باتوں پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اسے خاموش طریقے سے بھیک مانگنا منظور تھا لیکن جھوٹ بولنا منظور نہیں تھا۔ چونکہ اسے جھوٹ بول کر مانگنا نہیں آتا تھا اس لئے اسے بھیک بھی کم ملتی تھی۔

کم بھیک لانے پر اسے روز ہی استاد کے لعن طعن کا سامنا کرنا پڑتا۔ شروع شروع میں تو استاد اسے روز ہی مارتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ شوکت پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا تو اس نے تھک ہار کر اسے مارنا پیٹنا چھوڑ دیا۔ البتہ بھیک کم لانے پر وہ شوکت کو روز جلی کٹی سناتا۔

شوکت جس جگہ بھیک مانگتا تھا اس کے قریب ہی جامع مسجد تھی جہاں ہر جمعہ کو مولوی صاحب تقریر کرتے اور خطبہ دیتے تھے۔ شوکت ان کی تقریر بڑے غور سے سنتا۔ اسے ان کی باتیں بے حد اچھی لگتیں۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہا دھو کر غسل کر کے مسجد میں جائے نماز پڑھے اور مولوی صاحب کی باتوں کو غور سے سنے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بھیک مانگتے وقت اس کا حلیہ ہی اتنا گندہ ہو رہا ہوتا کہ اسے اجلے اجلے صاف ستھرے لباسوں اور روشن چہروں والے نمازیوں کے درمیان جاتے ہوئے

شرمندگی ہوتی۔

شرمندگی تو اسے بھیک مانگتے وقت بھی ہوتی تھی جب وہ کشکول اٹھائے گلیوں، بازاروں میں گھومتا یا پھر مسجد کے گیٹ کے باہر کھڑا رہتا۔ اس نے کبھی منہ سے بول کر بھیک نہیں مانگی تھی۔ بس کشکول لئے خاموش کھڑا رہتا۔ لوگ اس کی مسکین اور پیاری سی شکل پر ترس کھا کر خود ہی اس کے کشکول میں پیسے ڈال دیتے۔ بغیر مانگے اور بغیر جھوٹ بولے ہی اسے بھیک مل جاتی تھی۔

شوکت نے جب سے ہوش سنبھالا تھا خود کو استاد کلن خان کے اڈے پر پایا تھا۔ اسے اس بات کا کوئی علم نہ تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں اور اسے کہاں سے لایا گیا ہے؟ اور بھی لڑکے جو استاد کے اڈے پر تھے انہیں بھی اپنے والدین کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ استاد کلن خان کو ہی اپنا مائی باپ سمجھتے تھے۔

استاد کلن خان کے پاس یہ بچے کس طرح آئے تھے یہ ایک لمبی کہانی تھی اور ایک روز یہ لمبی کہانی خود استاد کلن نے تمام لڑکوں کے سامنے سنائی تھی۔ جس میں اس نے مختصراً اپنی شریفانہ زندگی اور پھر گھناؤنی زندگی کی طرف آنے کا قصہ سنایا تھا۔ استاد کا کہنا تھا کہ شروع میں وہ ایک نہایت شریف انسان تھا۔ اس کا چھوٹا سا چائے خانہ تھا جسے وہ بڑی محنت، لگن اور ایمانداری کے ساتھ چلاتا تھا کہ ایک روز میری زندگی میں ایک دھماکہ ہوا اور مجھے چار سال کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا۔ ہوا یوں کہ جس جگہ میرا چائے خانہ تھا وہاں ایک بہت بڑا تاجر مارکیٹ اور فلیٹس بنانا چاہتا تھا۔ اس نے آس پاس کے دکانداروں سے ان کی جگہیں خرید لیں میرا چائے خانہ بھی وہ خریدنا چاہتا تھا لیکن میں وہ جگہ چھوڑنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔ وہ چائے خانہ میرے باپ نے بڑی محنت سے بنایا تھا اور اس چائے خانے سے میرے باپ کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ میں اپنے باپ کی نشانی کو کسی بھی قیمت پر تاجر کے حوالے نہیں کر سکتا تھا اس نے پہلے تو چائے خانے کی بڑی بھاری قیمت دینی چاہی لیکن جب میں راضی نہ ہوا تو اس نے بہت سے بدمعاش بھیج کر میرے ہوٹل کو تباہ و برباد کر ڈالا پھر پولیس بھیج کر مجھے تھانے میں بند کروادیا۔ پولیس نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں منشیات (نشے کا سامان) بیچتا ہوں اور میرا چائے خانہ منشیات کا اڈا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پولیس نے میرے چائے خانے سے بھاری مقدار میں منشیات بھی برآمد کرلیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے خلاف سازش کی جارہی ہے۔ میں نے بہت شور مچایا لیکن میری کوئی بات نہیں مانی گئی۔ عدالت میں مقدمہ چلا۔ تاجر نے اپنے آدمیوں کی مدد سے جھوٹی گواہی دلوائی اور عدالت نے مجھے چار سال قید بامشقت کی سزا سنا ڈالی۔ اور پھر مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل کی زندگی نے میری شخصیت کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہاں رہ کر میں نے چوری، جیب تراشی اور لڑائی جھگڑوں کے

نت نئے طریقے سیکھے۔ چار سال سزا کاٹنے کے بعد جب میں جیل سے باہر آیا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ میری بیوی بس کے حادثے میں انتقال کر گئی تھی جب کہ بچوں کو محلے والوں نے ایک یتیم و بے سہارا بچوں کی پرورش کرنے والے ادارے میں داخل کرا دیا تھا۔

جس ظالم تاجر سے میں اپنی بے گناہی کا انتقام لینا چاہتا تھا قدرت اس سے پہلے ہی انتقام لے چکی تھی جو مارکیٹ وہ بنا رہا تھا اس کا ملبہ اس پر گر پڑا تھا اور وہ اس ملبے کے نیچے دب کر مر گیا تھا۔ اس کے اس طرح مرنے کا پتہ چلا تو میں غصے سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ میں خود اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ اس سے اپنے قیمتی چار سالوں کا حساب لینا چاہتا تھا۔

وقت بیت جائے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ وقت کے بے رحم لمحے اپنے ساتھ بہت کچھ چھین لے جاتے ہیں۔ بہت سی تبدیلیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسی ہی بہت سی تبدیلیاں میرے حصے میں بھی آئی تھیں۔ اور ان تبدیلیوں نے مجھے بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب میں پہلے والا کلن خان نہیں رہا تھا۔ استاد کالے خان کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ بڑے بڑے بدمعاش میرا نام سنکر کانپتے اور اب بھی کانپتے ہیں حالانکہ اب مجھ میں پہلے جیسا دم خم نہیں رہا استاد اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اور لڑکے ایک ایک کر کے وہاں سے کھسک گئے۔

عیدالفطر قریب آچکی تھی۔ بازاروں کی رونق بڑھ گئی تھی۔ لوگ صبح و شام عید کی خریداری کرتے نظر آتے۔ عیدالفطر کی آمد سے لڑکوں کے "اوور ٹائم" کا وقت بھی بڑھ گیا تھا۔ استاد کی ہدایت تھی کہ عیدالفطر کی خریداری کے موقع پر بازاروں میں زیادہ سے زیادہ وقت "اوور ٹائم" (استاد چوری اور جیب تراشی کو اوور ٹائم کہتا تھا) کے لئے دیا جائے۔ استاد ایسے موقع پر خود بھی "اوور ٹائم" لگا رہا تھا۔

عید سے چند دن پہلے شوکت کے ساتھ عجیب بات ہوئی وہ اسکول کے سامنے کھڑا بچوں کو اسکول جاتا دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک کار اس کے قریب آکر رک گئی۔ کار کا دروازہ کھلا اس میں سے ایک بیگم صاحبہ نمودار ہوئیں۔ وہ شوکت کے قریب آکر بڑے غور سے اس کو دیکھنے لگیں۔ شوکت ان کی نگاہوں کی گرمی سے گھبرا سا گیا۔ بیگم صاحبہ کے شوہر بھی کار سے اتر آئے۔ بیگم صاحبہ نے پلٹ کر اپنے شوہر صاحب کی طرف دیکھا پھر بالوں کو ایک طرف جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"وکی! دیکھو تو یہ لڑکا!! .....

"ہاں! اپنے گڈو کی شکل سے کتنا ملتا ہے!!" بیگم صاحبہ کے شوہر نے بیگم صاحبہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بالکل اسی کی کاپی لگتا ہے۔ بس ایک معمولی سا فرق ہے اس میں اور گڈو میں۔ گڈو ایک بڑے آدمی کا بیٹا ہے اور یہ بے چارہ ..... شاید یتیم ہے یہ!" بیگم صاحبہ کا لہجہ ہمدردانہ سا ہو گیا۔ انہوں نے اپنے سنہری قسم کے بڑے سے پرس میں سے سو سو کے دو کرارے نوٹ نکالے اور شوکت کے کشکول میں ڈالتے ہوئے گویا ہوئیں:

"لڑکے! یہ پیسے رکھ لو۔ اپنے لئے کپڑے بنوالینا۔ عید بھی قریب ہے۔" اتنا کہہ کر بیگم صاحبہ نے شفقت سے شوکت کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور کار کا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گئیں۔ ان کے شوہر جو کہ پہلے ہی کار میں بیٹھ چکے تھے انہوں نے کار اسٹارٹ کر دی اور چند ہی لمحوں بعد کار شوکت کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بیگم صاحبہ چلی گئی تھیں لیکن شوکت ابھی تک گم صم کھڑا تھا بیگم صاحبہ کے شفقت بھرے ہاتھوں کا لمس ابھی تک اس کو اپنے سر پر محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی شوکت یہی کچھ سوچ سوچ رہا تھا کہ وہ چونک گیا۔ ایک اسی کی عمر کا لڑکا روتا ہوا اسکول کے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ شوکت سے اس کا رونا دیکھا نہ گیا۔ اس کے قریب جا کر بڑی محبت سے شوکت نے پوچھا:

"دوست! کیوں رو رہے ہو؟"

شوکت کا یہ سوال سن کر لڑکے نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا پھر روتے ہوئے اس نے بتایا کہ ماسٹر صاحب نے اس کا نام کاٹ دیا ہے۔

"مگر کیوں؟" شوکت نے پوچھا۔

"اس لئے کہ آج فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی اور میں فیس جمع نہیں کرا سکا" لڑکے نے بتایا۔

"لیکن! تم فیس کیوں نہیں جمع کرا سکے؟" شوکت نے سوال کیا۔

لڑکے نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہ یتیم ہے اور اپنی بوڑھی نانی کے پاس رہتا ہے۔ نانی غریب خاتون ہیں اس کی فیس نہیں بھر سکتیں۔

"کتنی فیس بھرنی ہے تمہیں؟" شوکت نے پوچھا۔

"پچانوے روپے" افسردہ لہجے میں لڑکے نے کہا۔

"یہ لو دو سو روپے۔ اپنی فیس بھرا دینا اور باقی جو پیسے بچیں ان سے اپنے لئے نیا سوٹ خرید لینا۔ عید بھی قریب آ گئی ہے۔"

شوکت نے بڑی محبت سے اس کی بند مٹھی کھول کر اس کی ہتھیلی پر دو سو روپے رکھ دیئے۔

اس لڑکے کی آنکھوں میں جگنو اتر آئے۔ ڈبڈباتی آنکھوں سے اس نے اپنی لرزتی مٹھی کی طرف دیکھا جہاں دو لال کرارے نوٹ چمک رہے تھے۔ "تت..... تت..... تم..... یہ..... یہ اپنی محنت کے پیسے..... مم..... مم مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

اتنا کہہ کر لڑکا ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر دوسرے ہی لمحے بولا "ان پیسوں کے تم زیادہ حقدار ہو۔" لڑکے نے پیسے واپس کرنے چاہے لیکن شوکت نے نہیں لئے۔ "نہیں ان پیسوں کے تم زیادہ حقدار ہو۔ میرے پاس تو بے شمار نئے جوڑے ہیں۔ یہ تو بھیک مانگنے کے لئے میں پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتا ہوں تاکہ لوگ ترس کھا کر زیادہ بھیک دیں" شوکت نے لڑکے کو مطمئن کرنا چاہا۔ (شوکت نے سچ ہی کہا تھا استاد نے ہر لڑکے کے بہت سے کپڑے سلوا رکھے تھے۔ بھیک مانگتے وقت لڑکوں کو پھٹے پرانے کپڑے پہننے پڑتے اور جب لڑکے بھیک مانگ کر واپس آجاتے تو نہا دھو کر اپنے نئے جوڑے پہن لیتے)

"تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟" اسکول والے لڑکے نے پوچھا اب وہ شوکت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

"مجبوری ہے!" شوکت بولا "کیا مجبوری ہے؟"

"میں بتا نہیں سکتا!!" "کیوں نہیں بتا سکتے؟" "بس نہیں بتا سکتا۔"

"ٹھیک ہے نہ بتاؤ! لیکن یہ پیسے میں نہیں لوں گا کیونکہ یہ بھیک کے پیسے ہیں اور مجھے بھیک کے پیسے لینا گوارا نہیں۔"

اسکول والے لڑکے کی آواز میں خودداری کا جذبہ نمایاں تھا۔

شوکت کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ بھیک مانگنا تو اسے بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

اس نے اسکول والے لڑکے کا ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے کہا۔

"دوست! یہ بھیک کے پیسے نہیں ہیں بلکہ ایک بیگم صاحبہ نے مجھے اس لئے خوش ہو کر دیئے ہیں کہ میں ان کے بیٹے سے ملتا جلتا ہوں۔" شوکت کے قائل کرنے پر لڑکے نے پیسے لے لئے اور شوکت کے ہاتھ چوم کر احسان مند نگاہوں سے شکریہ ادا کرتا ہوا اپنی فیس بھرانے اسکول کے اندر چلا گیا۔

ایک غریب لڑکے کی مدد کر کے شوکت کو بے انتہا خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

شام کو جب وہ اڈے پر پہنچا تو تمام لڑکے اپنے دھندوں سے واپس آچکے تھے استاد سب سے پیسوں کا حساب لے رہا تھا۔ شوکت کی باری آئی تو استاد چلّا اٹھا۔ "بس بیس روپئے!!" آج سارے دن میں صرف بیس روپئے کمائے تم نے؟"

شوکت نے چاہا کہ بول دے "نہیں استاد آج تو سب سے زیادہ پیسے ملے ۲۰ نہیں بلکہ ۲۲۰....."

لیکن اس سے یہ بولا نہ گیا۔ سر جھکا کر شوکت نے اپنی زندگی کا پہلا جھوٹ بول دیا "استاد آج قسمت ہی خراب تھی۔ سارے دن میں صرف بیس روپے ہی مل سکے!!"

شوکت کا جواب سن کر استاد چلّانے لگا: "ابے میں نے کتنی بار تجھ سے کہا ہے خاموش رہنے سے بھیک نہیں ملتی جھوٹ بولنے سے ملتی ہے۔ جھوٹ بول کر ہی لوگوں کی جیبوں سے پیسہ نکالا جاتا ہے۔" استاد ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر دوسرے ہی لمحے بولا: "یہ بات یاد کرلے شوکت سچ کی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں۔ سچ ہمیشہ یتیم رہا ہے کمزور رہا ہے دنیا میں اگر قدر ہے تو صرف جھوٹ کی اور پیسوں کی۔"

دوسرے تمام لڑکے زیادہ پیسے لائے تھے اور ان کا "اوور ٹائم" بھی خوب لگا تھا اس لئے شوکت کو مار نہ پڑی۔ استاد لڑکوں سے پیسوں کا حساب کتاب لینے لگا جب کہ شوکت کے ذہن میں استاد کی باتیں آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکنے لگیں۔

بار بار اس کے دماغ میں استاد کے فقرے گونجنے لگے۔

سچ ہمیشہ سے یتیم رہا ہے، کمزور رہا ہے۔ سچ کی کوئی اہمیت نہیں۔ سچ کی کوئی اہمیت نہیں!!

شوکت کو یوں لگا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ پھر اچانک ایک عجیب سی بات ہوئی وہ روتا ہوا استاد کے قدموں میں گر گیا تمام لڑکے حیرت سے اسے تک رہے تھے اور وہ استاد کے قدموں میں پڑا رو رہا تھا کہہ رہا تھا:

"استاد! مجھے معاف کردو میں نے جھوٹ بولا ہے مجھے بھیک میں ۲۰ روپے نہیں دو سو بیس روپے ملے تھے" شوکت نے روتے ہوئے استاد کو سارا قصہ سنا ڈالا کہ کس طرح ایک بیگم صاحبہ نے اسے ۲۰۰ روپے دیئے جو اس نے ایک غریب لڑکے کی مدد میں صرف کر دیئے۔ شوکت جیسے جیسے قصہ بیان کرتا جارہا تھا استاد کے چہرے کا تاثر بدلتا جارہا تھا جب شوکت نے اپنی بات مکمل کرلی تو استاد نے شوکت کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔ "شوکت!" استاد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں بہت برا انسان ہوں میں تم لوگوں کا ہی نہیں اپنے خدا کا بھی مجرم ہوں ہوسکے تو اپنے ظالم باپ کو معاف کردینا۔" استاد نے روتے ہوئے سب لڑکوں کو اپنے سینے سے لگالیا اور لڑکوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں پناہ مل گئی ہو۔

وقت فرینکلن کی نظر میں

انتخاب:۔ سحر ناز، لاہور

وقت دولت کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں۔ یاد رکھو تم دولت تو کما سکتے ہو۔ وقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

قلم قافلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہوسکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔ (ادارہ)

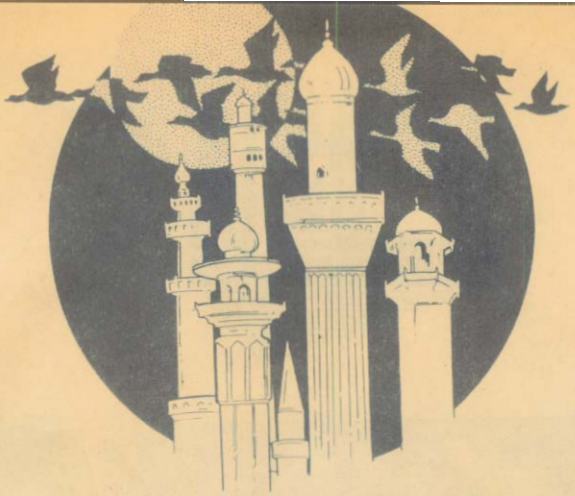

ایک واقعہ

مرسلہ : مفتی مختار علی

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک اعرابی آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ؐ نے اس کی طرف توجہ فرمائی تو اس نے بتایا کہ وہ مسلمان ہونے کے ارادے سے آیا ہے۔ آپ ؐ کو بڑی خوشی ہوئی آپ ؐ نے اسے کلمہ پڑھایا اور وہ مسلمان ہو گیا۔

حضرت علیؓ بھی حضور ؐ کی صحبت میں موجود تھے۔ سرور کائنات ؐ نے انہیں حکم دیا کہ اس اعرابی کو ساتھ لے جائیں اور اسے قرآن پڑھائیں۔ حضرت علیؓ اعرابی کو ساتھ لئے گئے مگر تھوڑی دیر بعد واپس آگئے اور آکر آپ ؐ سے شکایت کی کہ اعرابی کچھ پڑھے بغیر ہی چلا گیا۔ آپ ؐ نے فرمایا "تم نے اسے کچھ تو پڑھایا ہو گا؟" حضرت علیؓ نے عرض کیا "میں نے اسے صرف ایک سورت پڑھائی تھی کہ وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا بس بس میں سمجھ گیا، پھر میں نے اسے روکا مگر وہ نہ رکا اور چلا گیا۔"

حضور ؐ نے کہا "تم نے اسے کون سی سورت پڑھائی تھی؟" حضرت علیؓ نے کہا "میں نے اسے سورۃ "الزلزال" پڑھائی تھی جب میں اس کی آخری آیت پر پہنچا اور میں نے اسے پڑھایا کہ ترجمہ "جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اپنی نیکی کو دیکھے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اپنی برائی کو دیکھے گا" تو اس نے پڑھنا بند کر دیا۔"

آپ ؐ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا "اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے بیشک وہ سمجھ گیا کہ "سورۃ الزلزال" کی آخری آیات کا مطلب یعنی "جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اپنی نیکی کو دیکھے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اپنی برائی کو دیکھے گا۔

عجیب عادت

نامعلوم

کاشف ایک ننھا منا سا بچہ تھا مگر اس کے اخلاق بہت اچھے تھے۔ بڑوں کا ادب کرنا اور غریبوں کی مدد کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

کاشف کے ننھے منے سے ذہن میں ایک بات یہ بیٹھ چکی تھی کہ جس طرح پودوں کے بیج بونے سے پودا بنتا ہے اس طرح پیسوں سے بھی درخت بنتا ہوگا جس پر بہت سے پیسے لگیں گے بظاہر تو یہ ایک ناممکن سی بات تھی مگر کاشف یہ سمجھتا تھا کہ یہ بات ضرور پوری ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے امی ابو جو بھی پیسے دیتے وہ جا کر باغیچہ میں دبا دیتا تھا مگر آج تک پیسوں کا درخت تو کیا چھوٹا سا پودا بھی نہیں اُگا تھا اس لئے وہ ہر وقت پریشان رہتا تھا۔

کاشف کے ابو ایک دفتر میں کلرک تھے اور کاشف ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

ایک دن اچانک کاشف کے ابو بیمار ہوگئے اور بیماری بڑھتی چلی گئی۔ تنخواہ کے تمام پیسے ان کے علاج پر خرچ ہوگئے۔ گھر میں کچھ نہ بچا حتیٰ کہ نوبت فاقوں تک آپہنچی۔

اچانک کاشف کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ پیسے نکالے جائیں جو زمین کے اندر دبائے تھے کیونکہ ان سے پودا نکلا نہ تھا۔ یہ سوچ کر وہ باغیچہ میں گیا اور زمین کھودنی شروع کی۔ اس میں سے تمام پیسے نکالے اور امی کو دیئے۔ امی نے اتنے ڈھیر سارے پیسوں کے متعلق پوچھا تو کاشف نے انھیں سب کچھ بتا دیا۔ یہ بات جب ابو کو پتا چلی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کاشف کو گلے لگا لیا۔

اس طرح کاشف کی اس عادت کی وجہ سے ان کا گھر سنور گیا۔

پاک دھرتی

تجھ کو اے پاک دھرتی! جنت نشاں کریں گے
ہم تیری عظمتوں کے نغمے بیاں کریں گے
بھردیں گے روشنی سے ہر تیرا ذرہ، ذرہ
اپنے لہو سے روشن، تیری فضا کریں گے
تو پاک سرزمیں ہے، تجھ کو اے پاک دھرتی
سارے جہاں سے بڑھ کر، ہم خوش نما کریں گے
ہم نونہال سارے تجھ کو نہ مٹنے دیں گے
دل اپنا، جان اپنی، تجھ پر فدا کریں گے
دنیا میں نام ہوگا، چرچا بھی عام ہوگا
علم و عمل کا ایسا روشن دیا کریں گے
ہم تیری عظمتوں کے بن کر امین ایسے
تجھ کو نہ جلنے دیں گے، ہم خود جلا کریں گے
دینا پڑا جو ہم کو، دیں گے لہو بھی راہیؔ
اپنے وطن کی خدمت یوں ہی سدا کریں گے

بابائے قوم غیروں کی نظر میں

خالد خلیل، کراچی

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے وہ ایک عظیم لیڈر تھے ان کی عظمت کا اعتراف اپنوں ہی نے نہیں غیروں نے بھی کیا ہے۔ یہاں دنیا کی چند معروف شخصیتوں کے قائداعظم کے متعلق خیالات تحریر کئے جا رہے ہیں۔

گاندھی:۔ قائداعظم بلاشبہ اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے وہ سیرت و کردار کی ان بلندیوں پر تھے جہاں کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی طعنہ انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔

سر ونسٹن چرچل:۔ قائداعظم بڑے ذہین و فطین سیاست داں ہیں اور میں مسلمانوں کے اس بڑے لیڈر کی یاد کو کبھی دل سے بھول نہیں سکتا۔ مسٹر جناح آج کی دنیا میں عظیم ترین مدبر اور عظیم ترین انسان تھے۔

راج گوپال اچاریہ:۔ قائداعظم بلند پایہ شخصیت کے حامل انسان ہیں۔ ان کو ملک میں زبردست مقبولیت حاصل ہے۔ ان کی اندھی پیروی کی جارہی ہے اور یہی سچی ہمدردی بھی ہے۔

بیورلی نکولاس :۔ ایک محدود اور مختصر مدت میں ہندوستان دنیا کا نازک ترین مسئلہ بننے والا ہے اور مسٹر جناح اس انقلاب آفریں دور کے ہیرو ثابت ہوں گے۔

مسز اینی نبسنٹ :۔ جناح جیسی شخصیت بنی نوع انسان کی آزادی کے گلے کا ہار ہے۔ جس کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی۔

ماسٹر تارا سنگھ :۔ قائداعظم نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی سے بچالیا اگر یہ شخص سکھوں میں پیدا ہوتا تو اس کی پوجا کی جاتی۔

کیلاش ناتھ :۔ اس صدی کی نمایاں ترین ہستی جناح کی ہستی تھی۔

چیف جسٹس لارڈ پیٹرک اسپنس :۔ میرے واقف کار لوگوں میں جناح سب سے زیادہ راست باز تھے اور جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے ساری زندگی ایک لمحے کے لئے بھی کسی کو فریب دینے کی کوشش نہیں کی۔

کلیمنٹ اٹیلی :۔ مسٹر جناح کا بے مثل جذبہ حریت اور شب و روز محنت ہی وہ سرمایہ ہے جس نے پاکستان جیسے ملک کی بنیاد ڈالوائی۔

لارڈ ماونٹ بیٹن :۔ قائداعظم اگر کسی فریق سے سمجھوتہ کرتے تھے تو جھک کر نہیں بزدلانہ انداز میں نہیں، مردانہ وار سمجھوتہ کرتے تھے۔

مسز وجے لکشمی پنڈت :۔ اگر مسلم لیگ کے پاس سو گاندھی اور دو سو ابوالکلام آزاد ہوتے اور کانگریس کے پاس صرف ایک لیڈر قائداعظم محمد علی جیسا ہوتا تو ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوتا۔

لارڈ ڈیول :۔ مسٹر جناح اپنے ارادوں اور اپنی رائے میں بے حد سخت ہیں ان کے رویئے میں کوئی لوچ نہیں وہ مسلم قوم کے مخلص رہنما ہی نہیں بلکہ سچے وکیل بھی ہیں۔

ہنری ایس ٹرومین :۔ مسٹر جناح کو اپنی محنت اور جدوجہد کے عوض وہ مسلمان قوم اور ملک ملا جس کے وہ اہل تھے قائداعظم نے خواب کو حقیقت کا روپ دے کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ قومیں

استقلال اور پامردوں کے زور پر بنتی ہیں۔

مسولینی:۔ قائداعظم کے لئے یہ بات کہنا غلط نہ ہوگی کہ وہ ایک ایسی تاریخ ساز شخصیت ہیں جو کہیں صدیوں میں جاکر پیدا ہوتی ہے۔

ہیکٹر بولاتھو:۔ میں دنیا کے سات عظیم شخصیات کی داستان حیات لکھ چکا ہوں میں نے دنیا بھر میں چکر لگائے ہیں اور عظیم انسانوں سے ملا ہوں لیکن جس قدر احترام اور خلوص کا احساس میں قائداعظم کی نسبت کرتا ہوں وہ کسی اور شخصیت کی نسبت نہیں کرتا۔

مسز سرور جنی نائیڈو:۔ وہ ایک انسان تھے۔ ان کی سربلندی و عظمت یک جہت تھی اور خلوص مقصد ان کا سرچشمہ۔ ان کا احساس فرض کی حدت کبھی ٹھنڈی نہ پڑی۔ ذاتی زندگی بالکل پاکیزہ۔

ضمنی انتخاب

محمد شاہد فیروز، گوجرانوالہ

"چٹ پٹی دال لے لو بھائی صاحب..... بارہ مسالحوں والی دال ہے لے لو..... کھائیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔ یہ خستہ بسکٹ بھی ہیں بھائی صاحب..... مزے مزے کی ٹافیاں لے لو بھائی صاحب..... لے لو۔ لے لو بڑے مزے کی چیزیں ہیں....." انور سر پر بڑی پلیٹ اٹھائے ہوئے پولنگ اسٹیشن کے باہر ادھر سے ادھر آجا رہا تھا اور اس کی کاروباری مہارت سے بھرپور آواز دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔

انور آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس چھوٹی عمر میں پڑھائی کے ساتھ دیگر

کام کرنا یقیناً ہمت اور حوصلے کی بات تھی اور اسے یہ حوصلہ اپنی امی کی طرف سے ہی ملا تھا۔ باپ تو شاید بہت بزدل شخص تھا۔ جو گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کی بجائے اپنی بیوی بچے کو تن تنہا چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور پھر کبھی ان کی خبر تک نہیں لی تھی۔

انور کی امی ایک عقلمند اور حوصلے والی خاتون تھیں۔ نو دس سال پہلے جب انور چھوٹا سا بچہ تھا اس وقت انہیں شوہر کی جدائی ملی تھی۔ عام عورت ہوتیں تو یقیناً ہمت ہار جاتیں اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتیں۔ مگر انہوں نے تو کمال ہمت سے کام لیتے ہوئے تمام حقیقتوں سے سمجھوتا کر لیا اور اپنے واحد بیٹے انور کو ہی اپنی کل کائنات سمجھ کر اس کی پرورش کرنے لگیں۔ ابتدا میں انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ قریبی رشتے دار، عزیز تو تھے نہیں کہ ان سے مدد مانگ سکتیں۔ بوڑھا باپ جس نے ان کی شادی کی تھی۔ وہ کب کا دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ غرضیکہ وہ اگر اپنے اور انور کے پیٹ کی آگ بجھا سکتیں تھیں تو خود ہی۔ کسی دوسرے کا سہارا نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد ٹافیوں کی ایک فیکٹری میں پیکنگ کا کام شروع کر دیا اور یوں زندگی کی گاڑی مدہم رفتار سے چلنے لگی۔ انور کچھ بڑا ہوا تو انہیں اسے پڑھانے کا خیال بھی آیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے سے زیادہ محنت کر کے انور کو پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ انور کی خاص انداز اور خاص ماحول میں پرورش کر رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انور کم عمری میں بھی ایک سنجیدہ لڑکا تھا اور جب اس نے ساتویں پاس کی تو اپنی امی سے ضد کر کے کام کی فرمائش کی وہ تو اسے پڑھانا چاہتی تھیں چنانچہ انکار کر دیا مگر انور نے بھی انہیں یہ کہہ کر لاجواب دیا کر دیا کہ "امی میں پڑھائی تھوڑی چھوڑ رہا ہوں میں تو چاہتا ہوں کہ اسکول سے آکر کوئی کام کر لیا کروں۔"

"مگر تم کام کونسا کرو گے؟"

"امی آپ مجھے بسکٹ، ٹافیاں اور دال وغیرہ لے دیں تو میں وہ گلی گلی بیچ آیا کروں گا۔ میں نے بہت سے لڑکوں کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔" وہ رضامند ہو گئیں اور یوں انور بڑی سی پلیٹ میں یہ سامان سجائے بیچنے لگا۔ وہ اسکول سے واپس آتے ہی پلیٹ اٹھائے نکل جاتا اور شام کو واپس آکر رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ وہ اپنے بیٹے کو اتنے کام کرتے دیکھ کر پریشان تو ہوتیں تھیں کیونکہ انور انہیں جان سے پیارا تھا اور ان کا

واحد سہارا تھا مگر وہ مجبور تھیں کیونکہ گھر اور اسکول کا خرچ وہ اکیلے پورا نہیں کر سکتی تھیں۔

آج ملک میں ضمنی انتخابات ہو رہے تھے اور اس سلسلے میں انور کے حلقے میں بھی ووٹنگ ہونی تھی۔ انور کی چونکہ اسکول سے چھٹی تھی اس لئے وہ صبح صبح ہی پلیٹ سنبھال کر باہر نکل گیا۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر بیچتا رہا مگر جب لوگ ووٹ ڈالنے کے لئے جانا شروع ہوئے تو وہ بھی پولنگ اسٹیشن پہنچ گیا تاکہ وہاں زیادہ سے زیادہ سامان بیچ سکے اور وہ اس مقصد کے میں کافی کامیاب بھی رہا تھا۔ کیونکہ اس نے چند گھنٹوں میں ہی اپنا کافی سامان بیچ لیا تھا۔ وہ پلیٹ اٹھائے مسلسل آواز لگاتا ہوا ادھر ادھر آ جا رہا تھا اور لوگ دال، ٹافی اور بسکٹ وغیرہ خرید رہے تھے۔ پھر دفعتاً ایک لمبی سی کار پولنگ اسٹیشن کے قریب آکر رکی اس میں سے سات آٹھ آدمی نکلے اور پولنگ اسٹیشن میں گھس گئے۔ پولیس نے مزاحمت کی تو انہوں نے فائر کھول دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بھگدڑ مچ گئی لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے انور بھی وہاں سے بھاگا مگر کسی شخص سے ٹکرا کر اس کا سامان زمین پر بکھر گیا۔ انور کے اوسان خطا ہوگئے کیونکہ اس کی روزی کا ذریعہ زمین پر گر چکا تھا۔ وہ ٹافیاں اٹھانے کے لئے تیزی سے جھکا اسی وقت کلاشن کوف کا ایک برسٹ اس کی طرف آیا اور دو تین آدمی خون میں لت پت ہو کر زمین پر جاگرے انور بھی انہی میں شامل تھا۔ لمحہ بھر میں اس کا گرم اور گاڑھا خون خستہ خستہ بسکٹوں میں جذب ہونے لگا۔

صفائی

مرسلہ: عذرا ناز

ہے جن کو صفائی سے الفت زیادہ
ہے ان کی زمانے میں عزت زیادہ
صفائی سے انساں کی ہے دوستی
بدن میں صفائی سے بڑھتی ہے چستی
خیالات رہتے ہیں سب پاک اس سے
ذہانت بھی ہوتی ہے چالاک اس سے
ترقی کا رستہ دکھاتی ہے ہر دم
برے دوستوں سے بچاتی ہے ہر دم
بڑے کام کی چیز ہے یہ صفائی
ہے اس کے کرشموں کی قائل خدائی

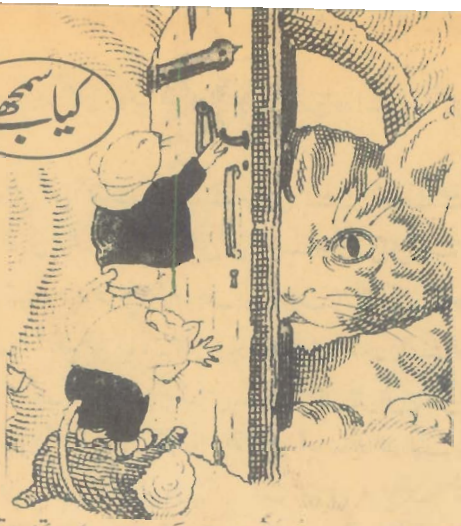

آنکھ مچولی کے ساتھ دیئے جانے والے کمسن بچوں کے تحفے "تتلی" کے سرورق پر بنے ہوئے اسکیچ کو کہانی کا موضوع بنا کر، ہم نے آپ کو لکھنے کی دعوت دی تھی۔

چونکہ "تتلی" کی کوئی اشاعت عنقریب متوقع نہیں ہے اس لئے اس تحریر کو ہم قلم قبیلے میں شائع کر رہے ہیں۔ ناہید شیر محمد کی اس کہانی کو مقابلہ کہانی نویس میں اول قرار دیا گیا ہے۔

ٹونکی، پونکی اور مانو

ناہید شیر محمد حیدرآباد

"ارے ارے دروازہ بند کر دو، جلدی کرو تم میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ ورنہ وہ مانو کیٹی ہم پر حملہ کر دے گی۔" ٹونکی نے اپنی پھولی ہوئی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ پونکی نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

چررر..... کی آواز کے ساتھ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور مانو کیٹی کی ایک آنکھ دروازے میں دکھائی دی۔ ٹونکی اور پونکی کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے حواس بحال رکھے اور جلدی سے ٹونکی نیچے کو جھکا اور پونکی نے اس کی پیٹھ پر چڑھ کر دروازے کی کنڈی لگانے کی کوشش کی۔ ادھر مانو بلی کا یہ حال تھا کہ اگر دروازہ تھوڑا سا اس کے سائز کا ہوتا تو وہ فوراً ان دونوں

چوہوں کو اپنے لنچ میں شامل کر لیتی۔ اس خیال کے تحت مانو نے اپنا ہاتھ بل کے اندر کیا۔ ٹونکی اور پونکی کو اسی لمحے کا انتظار تھا انہوں نے جلدی سے دروازے پر روز لگایا اور مانو کا ہاتھ دروازے میں دب گیا۔

"ہائے میں مری۔ ہائے میرا ہاتھ چھوڑ دو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ تم تو میرے پیارے پیارے بھائی ہو۔ اوئی بہت تکلیف ہو رہی ہے ہائے، ہائے میرا ہاتھ۔" ٹونکی اور پونکی نے اس کی باتوں پر ذرا بھی دھیان نہ دیا اور وہ دروازے پر مزید دباؤ ڈالتے رہے۔ تھوڑی دیر میں مانو کیٹی کے کانوں میں اس کی مالکن کی آواز آئی۔

"مانو کیٹی! مانو کیٹی! اوہو تم یہاں کیا کر رہی ہو، مجھے پتہ ہے تم ان شریر چوہوں کو کھانے کا طریقہ سوچ رہی ہوگی۔ ایک تو تم کھاتی بہت ہو۔ میں روزانہ تمہارے لئے قصاب کے ہاں سے اتنے عمدہ چھیچھڑے منگاتی ہوں لیکن تمہارا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اوہو اب چلو بھی۔" اور مالکن نے اسے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گود میں اٹھالیا۔ دھڑکی آواز کے ساتھ ہی ننھا سا دروازہ بند ہو گیا۔ اب یہ تو بیچاری مانو کو ہی پتہ تھا کہ جتنا مزہ ان شریر چوہوں کو پکڑ کر کھانے میں تھا اتنا مزہ ان عمدہ چھیچھڑوں میں کہاں اور مانو یہ سوچ کر رہ گئی کہ "چلو پھر کبھی سہی۔"

نصیحت

محمد رفیع اے، کراچی

کسی ملک میں ایک سوداگر رہا کرتا تھا۔ اس کا صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ سوداگر فاضل بھی تھا اور چاہتا تھا کہ میرا بیٹا بھی خوب علم حاصل کرے۔ سوداگر کا بیٹا بھی حصول علم کا خواہش مند تھا اور حصول علم کے لئے کوشاں رہتا تھا، لیکن وہ اپنے باپ کی نصیحتوں پر کم دھیان دیتا تھا۔ وہ سمجھتا

تھا کہ میرا باپ پرانے زمانے کا بوڑھا ہے اور اسے نئے زمانے کا کیا پتا۔ ۔۔۔ اگر جب کاروبار سنبھالنے کے قابل نہ رہا تو اس نے تمام کاروبار اپنے بیٹے کے سپرد کر دیا اور کہا "بیٹا! دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہر چیز وقت پر کام دے جاتی ہے۔ یہ سوکھی جھاڑیاں اور زمین پر پڑی ہوئی لکڑیاں بھی کام دے جاتی ہیں۔" سوداگر کے بیٹے نے دل میں اپنے باپ کی بات کا امتحان لینے کا خیال کیا۔

اتفاق سے اسی دن سوداگر کے بیٹے کو تجارت کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر جانا تھا۔ لہٰذا ضروری سامان اکٹھا کیا اور باپ کی کہی ہوئی بات کا امتحان لینے کی غرض سے ایک تھیلے میں چند پتھر اور تھوڑی سی مٹی بھی ڈال دی۔ یہ سب سامان لے کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور سفر پر روانہ ہو گیا راہ میں جنگل پڑتا تھا۔ جب وہ جنگل سے گزرا تو ایک شیر نظر آیا شیر کافی بھوکا تھا اور اپنے شکار کی تلاش میں تھک کر بیٹھا تھا۔ سوداگر کے لڑکے کو جس راستے سے جانا تھا شیر اسی راستے پر بیٹھا تھا۔ سوداگر کے لڑکے کو ایک ترکیب سوجھی اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک پتھر نکال کر راستے کے پیچھے کی جھاڑیوں میں پھینکا شیر یہ سمجھا کہ کوئی ہرن جھاڑی میں بیٹھا ہے اس نے جھاڑی پر حملہ کیا تو سوداگر کے لڑکے نے تھیلے سے ایک اور پتھر نکال کر دوسری جانب کافی فاصلے پر پھینک دیا شیر پتھر کی جانب بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سوداگر کے بیٹے کو موقع مل گیا اور وہ وہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلا۔ واپسی پر سوداگر کے بیٹے کے پاس تجارت کا مال فروخت کرنے کے بعد جو پیسے تھے وہ اس کے پاس تھے جب وہ ایک ریگستان میں سے گزر رہا تھا تو ایک مسلح رہزن نے اسے روک لیا۔ رہزن نے تلوار سوداگر کے بیٹے کو دکھا کر مطالبہ کیا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اسے دے دے۔ اچانک سوداگر کے بیٹے کو تھیلے میں پڑی ہوئی مٹی کا خیال آیا تو سوداگر کے بیٹے نے رہزن سے کہا کہ میرے پاس صرف اس تھیلے میں کچھ ہیرے ہیں۔ رہزن نے یہ سمجھا کہ واقعی ہیرے ہوں گے رہزن نے کہا کہ نکالو ہیرے۔ سوداگر کے بیٹے نے تھیلے میں سے مٹی نکال کر رہزن کی آنکھوں میں جھونک دی۔ رہزن بوکھلا گیا اور تلوار پھینک کر آنکھ ملنے لگا سوداگر کے بیٹے نے فوراً تلوار اٹھائی اور رہزن کو تلوار کی نوک کی زد پر شہر لے آیا اور شہر کے کوتوال کے حوالے کر دیا۔ اب سوداگر کے بیٹے کو یقین ہو گیا کہ اس کا باپ ٹھیک کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں۔

نومبر ۱۹۹۱ء کے شمارے میں اسد محمود راؤ کی ترجمہ شدہ تحریر "چشم تصور" نقل شدہ ہے۔ اس لئے اُن کا نام بلیک باکس میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ ثبوت فراہم کرنے پر ناصر حسین خادم کراچی کا ممنون ہے۔

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن

نام _____ کلاس _____

عمر _____ اسکول _____

پتہ _____

_____

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____

کلاس _____ پسندیدہ مضمون _____

مستقبل کا خواب _____

اسکول _____

گھر کا پتہ _____

تصویر اس سائز میں ہو۔

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) _____

تحریر بھجوانے کے لیے یہ کوپن اپنی تحریر کے ساتھ منسلک کر کے بھجوائیے

نام _____ عمر _____ تعلیم _____

کس طرح کی تحریریں لکھنا پسند کرتے ہیں۔ (مزاح/سنجیدہ/تراجم/کہانی/ایڈونچر یا کچھ اور

مکمل پتہ معہ فون نمبر _____

برائے استعمال دفتر آنکھ مچولی:

I۔ ناقابلِ اشاعت II۔ قابلِ اصلاح III۔ قابلِ اشاعت

کُل صفحات جوابی لفافہ ہمراہ ( ) تاریخ جواب ( )

ساتھی بچپن کے

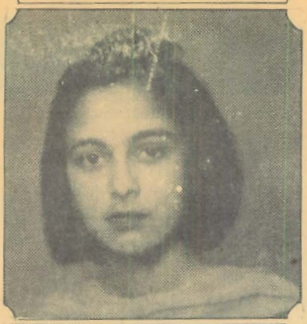

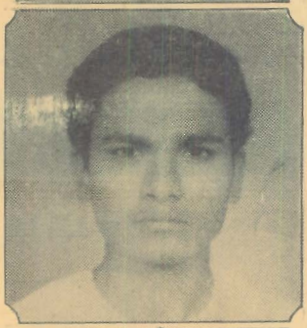

عشرت خالق ۱۵ سال گیارہویں
مشاغل: مطالعہ کرنا اور مصوری
پسندیدہ مضمون: انگلش
پتہ: لاہور

محمد ناصر ۱۶ سال گیارہویں
مشاغل: ٹکٹیں جمع کرنا اور سکے جمع کرنا
پسندیدہ مضمون: حساب
پتہ: مکان نمبر ڈی-۱۹ لیاقت ایونیو، ماڈل کالونی کراچی

سلمان مراد ۱۵ سال گیارہویں
مشاغل: کہانی لکھنا، ٹکٹیں جمع کرنا
پسندیدہ مضمون: ریاضی
پتہ ۲/۴۰۲ ناظم آباد نمبر ۴، کراچی ۱۸

یاور زمان بارہ سال ہشتم
مشاغل: آرٹ، مطالعہ کرنا، فٹبال کھیلنا
پسندیدہ مضمون: نامعلوم
پتہ: ۶۴۳-بی یونٹ ۲ لطیف آباد حیدر آباد

دوستی بھی اللہ کے لیے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے (حدیث نبوی ﷺ)

ساتھی بچپن کے

دوستی بھی اللہ کے لیے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے (حدیثِ نبوی ﷺ)

راج کمار ۱۵ سال میٹرک
مشاغل: آنکھ مچولی پڑھنا
پسندیدہ مضمون: انگریزی
پتہ: ایکتا کلنک اینڈ میٹرنٹی ہوم، ٹیرہ رام پل جیکب آباد

کاشف عبدالرزاق ۱۵ سال نویں
مشاغل: کرکٹ کھیلنا، کہانیاں لکھنا
پسندیدہ مضمون: حساب
پتہ: ۲۲۹/۳ حسین آباد، ایف بی ایریا، کراچی

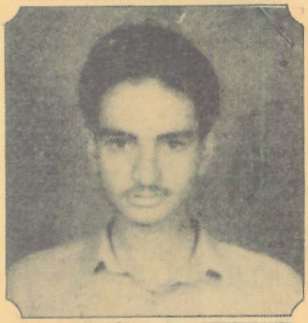

ابرار قدوس ۱۸ سال بارہویں
مشاغل: ٹی وی دیکھنا اور رسائل پڑھنا
پسندیدہ مضمون: فزکس اور ریاضی
پتہ: ۱۴/سی ۹۷۶ افشاں کالونی ڈھوک چوہڑیاں راولپنڈی

شہزاد شبیر ۱۴ سال دھم
مشاغل: قلمی دوستی، ٹکٹیں اور سکے جمع کرنا
پسندیدہ مضمون: انگریزی
پتہ: وارڈ نمبر ۹ چرچ روڈ، کریم پورہ لالہ موسیٰ

امی ابو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

اکثر گھروں میں بچوں کو بات بات پر ڈانٹا جاتا ہے۔ کہیں امی اور کہیں ابو، کبھی باجی اور کبھی بھیا ذرا ذرا سی بات پر یہ کہتے سنائی دیتے ہیں۔ "خبردار جو ایسا کیا"، "صوفے پر نہ چڑھو"، "چلو یہاں بیٹھ جاؤ"، "یہاں تمہارا کیا کام یہاں سے چلے جاؤ"، "ایسا کیا تو پٹائی ہو جائے گی" وغیرہ وغیرہ۔ ہماری ناقص رائے میں بچے کے ساتھ آپ کا یہ سلوک کچھ مناسب نہیں۔ اس میں ایک راہ اعتدال کی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ بچے کو کھیلنے کودنے اور شور کرنے کی آزادی دیں لیکن جہاں آپ محسوس کریں کہ کوئی بات حد سے تجاوز کر رہی ہے، وہاں اسے تنبیہ کریں یا سمجھا دیں، بات اس سے بھی آگے بڑھ جائے تو معمولی سرزنش کی جا سکتی ہے جو ضروری نہیں کہ ہاتھوں اور لاتوں کے حوالے سے ہو..... بچوں کو ہر وقت ٹوکنا، ڈانٹنا اور ملامت کرتے رہنا ان کی شخصیت کو سہما کر رکھ دے گا۔

کوئی ایسا تحفہ لائے
جو دل میں پھول کھلائے
احمد
بہترین حلوے یہ تین
سوہن حلوہ۔ حبشی حلوہ۔ کراچی حلوہ
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی۔۱۱۲۰، نورس روڈ، سائیٹ، کراچی

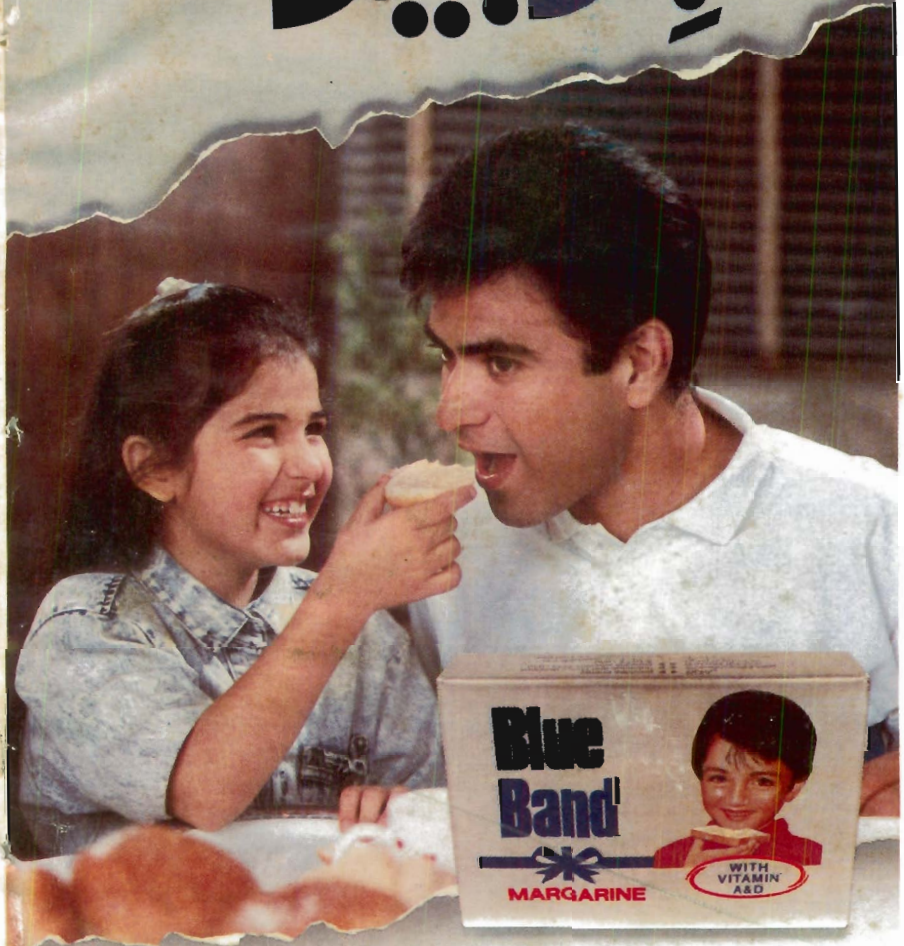

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

R-LINTAS